انتساب

جگر گوشۂ سلطان العارفین

جناب صاحبزادہ سلطان نیاز الحسن قادری

کے

نام

فہرست

(حضرت سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ کی جن مترجم کتب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ سب ''اللہ والوں کی قومی دُکان لاہور'' کی مطبوعات میں سے ہیں سوائے ان کے جن کی نشاندہی حوالے کے ساتھ کردی گئی ہے۔)

تقدیم

لفظ کی بھی اپنی تاریخ ہے بالکل ایسے ہی جیسے اس روئے زمین پر حضرت انسان کی اپنی تاریخ ہے' انسان کو اللہ تعالیٰ نے حیوان ناطق یعنی بولنے والی ہستی بنایا ہے' نطق یا گویائی اور ابن آدم کا ساتھ گویا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے' خالق کون و مکان نے اسی لیے احسن تقویم میں ڈھال کر اس اشرف المخلوقات کی تخلیق کو اپنا اعجاز اور باعث عز و شرف مخلوق قرار دیا ہے' اس عز و شرف کی اساس انسان کا دماغ اور اس کی زبان ہے' دماغ فکر و معنی کا کارخانہ ہے اور اس کارخانے میں جنم لے کر تیار ہونے والے فکر و معنی کو زبان لفظ کا لباس پہناتی ہے' اسی لفظ اور معنی کے امتزاج کو بیان کہا گیا اور پھر خلق الانسان (اس رب العزت نے انسان کو پیدا فرمایا) کے ساتھ ہی علمہ البیان (یعنی اسے بیان کرنا بھی سکھلا دیا) بھی فرما دیا گیا' حضرت آدم جو مسجودِ ملائک ٹھہرے تو اس لیے کہ رب ذوالجلال والاکرام نے انہیں تخلیق فرما کر تعلیم الاسماء یعنی لفظ و معنی کی تعلیم سے نوازا تھا' انسان کی ہستی جس طرح روح کی محتاج ہے' اسی طرح لفظ کا وجود معنی کا مقتضی ہے' جیسے جیسے انسان کے دماغی کارخانے نے معنی پیدا کیے اسی معیار و مقدار کے ساتھ زبان الفاظ کو جنم دیتی گئی' معلوم سے مجہول تک پہنچنا انسان کے دماغ کا کمال ہے مگر معلوم کے ذریعہ دریافت ہونے والے مجہول کو لفظ کا لباس زبان نے پہنایا' یہ جو کہتے ہیں

کہ انسانی تمدن کا ارتقا دراصل معلوم سے نامعلوم تک پہنچنے کی داستان ہے تو اسی طرح اس داستان کے لباس کی کہانی لفظ بھی ہے' یوں گویا لفظ کی تاریخ ہی درحقیقت انسان کی تاریخ ہے!

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ لفظ مختلف اوقات میں مختلف انسانی گروہوں کے ہاں موضوع سخن رہا ہے اور ہر ایک گروہ نے اپنے اپنے موضوع اور میدان میں عجب عجب موشگافیوں کی ایک دلچسپ داستان چھوڑی ہے' لغت یا زبان کی دنیا کے لوگوں نے کہا کہ لفظ اسی وقت کلمہ یا کلام قرار پائے گا جب اس کے کوئی معنی ہوں' ورنہ مہمل اور بیکار ہے' اہل نحو یا قواعد زبان کے لوگوں کا کہنا ہے کہ لفظ وہی کلمہ ہے جو صرف ایک ہی معنی ادا کرنے کے لیے وضع کرنے والا وضع کرتا ہے' اس لیے کہ واضع لغت نہ تو ایسا فضول شخص ہوتا ہے جو ایک معنی کے لیے کئی کئی لفظ بناتا رہے اور نہ اس کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ ایک ہی لفظ میں کئی کئی معنی کی جان ڈالتا جائے اور لوگوں کو تخلیط یا کنفیوژن میں مبتلا کرنے کا سامان کرتا جائے!

انسان نے جب لفظ اور معنی کو فنا سے بچانے اور محفوظ کرنے کی فکر کی ہوگی تو اس نے دیکھا ہوگا کہ اس کا بامعنی لفظ تو متعدد الاصوات ہے یعنی کئی ایک آوازوں سے مل کر بنتا ہے تو تب حضرت انسان نے حرف ایجاد کیا ہوگا اور یوں ہر آواز کے لیے ایک ایک حرف وجود میں آیا' مگر عربی لفظ اور عربی سے تعلق رکھنے والی زبانوں۔ فارسی اور اردو وغیرہ۔ کے لفظ کے کئی کئی حروف تو ہم شکل ہیں ہی چنانچہ ان ہم شکل حروف میں فرق اور امتیاز کے لیے نقطے ایجاد کرنا پڑے' یہاں سے حروف کے لیے صنعت اعجام یعنی حروف پر نقطے لگانا اور صنعت اہمال یعنی حروف کو نقطوں کے بغیر چھوڑ دینا وجود میں آئیں اسی لیے نقطوں والے حروف معجم اور نقطوں سے خالی حروف مہمل کہلائے' حرف کی یہ صنعتیں بھی لفظ کی داستان کے دلچسپ ابواب ہیں جو پڑھنے اور سننے سے تعلق رکھتے ہیں' مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر حرف کے نقطے نہ ہوں تو مہمل ہے جس کا مقابل معجم کہلائے گا اور اگر لفظ کے معنی نہ ہوں تو وہ بھی مہمل ہے جس کے مقابل کلمہ یا کلام ہوتا ہے!

لفظ اہل لغت کا دردسر بنا' کلمہ کبھی اہل قواعد زبان کا موضوع رہا اور کبھی فنون بلاغت والوں کے ہاں مشق ستم کا سزاوار ٹھہرا مگر حرف تو نہ جانے کتنے فنون بلکہ علوم کا موضوع سخن بن گیا اس لیے لفظ کی طرح حرف کو بھی حضرت انسان نے ایک تاریخ' ایک دنیا اور ایک کائنات بنا دیا ہے! خطاطی والوں نے بھی حرف کو بنایا سنوارا' لغت کے لوگ بھی حروف اور ان کے خصائص سے بحثیں کرتے رہے' قواعد زبان والوں کا رشتہ بھی اہل لغت سے ملتا ہے اس لیے حروف کے ابواب و بحوث ان کے ہاں بھی بڑی طویل اور کافی دقیق نظر آتی ہیں' خطاطی اور قرأت و تجوید والوں کے ہاں تو حروف کے بالوں کی کھالیں اترتی ہیں اور یہ سلسلہ جاری و ساری ہے ان بحثوں میں سے ایک ترتیب حروف کی بحث بھی ہے' چنانچہ حروف الہجاء یا حروف تہجی کی ایک تو سادہ اور بالکل سیدھی ترتیب ہے جسے الف باقی ترتیب یا ''الفابیٹک'' ترتیب کہتے ہیں' جدید عربی میں اسے اَلْفَبَئی یعنی الف باتاثا والی ترتیب کہتے ہیں مگر ایک ترتیب ابجدی بھی ہے جو عربی حروف تہجی کی لسانی قیمت کا تعین کرتی ہے جیسے ابجد' ہوز' حطی' کلمن' سعفص' قرشت' ثخذ' ضظغ اس ترتیب میں الف سے طا تک پہلے نو حروف اکائیاں ہیں یعنی ان کی قیمت ایک سے نو تک ہے مثلاً الف کا ایک نمبر' ب کے دو' جیم کے تین' دال کے چار' ہ کے پانچ' واؤ کے چھ' ز کے سات' ح کے آٹھ اور ط کے نو نمبر ہیں' ی سے ص تک کے نو حروف دہائیاں ہیں یعنی ی کی قیمت ۱۰' ک کی ۲۰' ل کی ۳۰' م کی ۴۰' ن کی پچاس' س کی ساٹھ' ع کی ستر' ف کی اسی اور ص کی قیمت نوے عدد ہے' پھر ق سے سینکڑا شروع ہوتا ہے اور غ پر ہزار پورا ہو جاتا ہے' گویا غ سے پہلے کے نو حروف دہائیاں ہیں جبکہ غ کے ایک ہزار عدد ہیں' حروف کی اس ترتیب میں حروف کی کل تعداد اٹھائیس ہوتی ہے اور ہمزہ الف کا بھائی شمار ہوتا ہے اسی لیے اس کی قیمت بھی الف کی طرح ایک ہی متصور ہوتی ہے' حروف تہجی کی اس ترتیب ابجدی نے علم الاعداد یا نمرولوجی کے پراسرار علم کو جنم دیا ہے چنانچہ اس علم والوں نے بھی اسرار الحروف کے عنوان سے کتب اور رسائل لکھے ہیں جبکہ دیگر علوم والوں نے بھی کتاب الحروف یا رسالۃ

الحروف کے نام سے بیشمار کتب اور رسائل تصنیف کیے ہیں جو اپنی اپنی جگہ دلچسپ موضوعاتی مطالعہ پیش کرتے ہیں' لغت' نحو' قرأت اور تجوید کے بڑے بڑے علماء اور اماموں نے اس عنوان سے اپنی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں' برعظیم پاک و ہند کے اہل علم میں سے حضرت امیر خسرو نے عربی زبان میں رسالۃ الحروف تصنیف فرمایا ہے جو دوسروں سے ممتاز و منفرد ہے اور ان کی عظیم کتاب انشا پردازی "اعجاز خسروی" میں شامل ہے۔

ائمہ اخلاق و تصوف نے بھی حروف کو موضوع سخن بنایا ہے اور ان کی قابل قدر کاوشیں ایک دلچسپ اور مفید مطالعہ کا سامان پیش کرتی ہیں' اہل طریقت و تصوف کے نزدیک کردار سازی اور تعمیر سیرت کو فوقیت حاصل ہے' تصوف اور طریقت کے بزرگوں کے ہاں انسان اسی نہج پر سنوارنے اور تیار کرنے پڑتے ہیں جس طرح دارارقم مکہ مکرمہ اور صفۂ مسجد نبوی مدینہ منورہ میں انسانوں کی ایک کارساز و کارگر لیکن پاکیزہ و مقدس جماعت تیار کر کے دنیا کو یہ سبق دیا گیا تھا کہ انسان اور ڈھلتے بنتے نہیں بلکہ بنانے اور ڈھالنے پڑتے ہیں' اگر کوئی مہتمم بالشان تحریک چلانا ہو اور کامیاب انقلاب برپا کرنا ہو تو اس کے لیے تربیت یافتہ کارکن درکار ہوتے ہیں جو ربع صدی کے اندر وقت کی دو بڑی عالمی قوتوں کو الٹ پلٹ کر تاریخ کی سب سے زیادہ انسانیت دوست' نفع بخش اور بے مثال سلطنت قائم کر سکے! دار ارقم میں نزول رحمت فرمانے والے اور صفہ مسجد نبوی میں اپنے صحابہ کرام کی سیرت سازی کرنے والے نبی رحمت ﷺ نے انسانیت کے سامنے یہی اسوہ حسنہ تو پیش فرمایا ہے جس کو نمونہ و مثال بنانے والے اور جس کی خوشۂ چینی کرنے والے ہم' وہ اور آپ سب ہیں۔ یہی سنت نبوی اہل تصوف و طریقت کا صبر آزما عمل تربیت ہے اس لیے انسان بنانے کے لیے انہوں نے جو طریقے استعمال کیے ان میں اسرار حروف کو خصوصی رنگ اور اہمیت حاصل ہے۔

دراصل بات صرف لفظ و معنی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اقرار و تصدیق اور عمل کے کٹھن مراحل بھی آتے ہیں' تعمیر اخلاق اور سیرت سازی کے دو ستون ہیں:

صداقت اور امانت! سیرت و اخلاق نبوی انہی دو ستونوں پر قائم ہیں! یہ صدق و امانت نبی صادق و امین ﷺ کی سیرت طیبہ اور اخلاق کریمانہ کا امتیاز ہیں' اسی پر سیرت سازی اور تعمیر اخلاق کا پیغمبرانہ عمل استوار ہوا' دنیاوی یا مادی زندگی کے میدان عمل میں بھی صدق و امانت کے دو اصول ہیں جو غیر متزلزل بھی ہیں' کارگر بھی اور بار آور و کارساز بھی لیکن روحانی زندگی کا عملی میدان تو ہے ہی سراپا صدق و امانت کا مرھون منت' اگر کہیں دنیاوی اور روحانی زندگی کے عملی میدانوں میں یہ صدق و امانت یک جا ہو جائیں تو ایک متوازن فرد' متوازن قوم اور متوازن معاشرہ وجود میں آ جاتا ہے مگر عملی زندگی میں یہ توازن و اعتدال قدرت کے اس کارخانہ کائنات میں آج تک صرف ایک ہستی کے حصے میں آیا ہے جو خاتم الانبیاء رحمۃ للعالمین اور محمد مصطفیٰ (ﷺ) ٹھہرے! یہ اسی ہستی کا اعجاز تھا کہ ان کے دست کرشمہ ساز پر ایک متوازن و معتدل جماعت بھی تیار ہوئی اور اعتدال و توازن کا حامل معاشرہ بھی قائم ہوا جس کا امتیاز یہی صدق و امانت کے دو ستون اور نسخہ کیمیا تھا' آج اگر مغرب کے انصاف پسند محقق تاریخ انسانی کی نمبر ایک قیادی شخصیت حضرت محمد ﷺ ہیں جو دنیاوی اور روحانی زندگی کے دونوں محاذوں پر کامیاب ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہونی چاہیے' تعجب کی بات اگر ہے تو یہ کہ ان مغرب والوں کو صدق و امانت کے دو ستون نظر نہیں آ سکے جو راز ہے اس عظیم الشان اور منفرد کامیابی کا! قول و عمل میں کامیابی کی اساس یہی صدق و امانت کے دو ستون دو اصول اور روشنی کے دو مینار ہیں جہاں لفظ کے ساتھ معنی کے امتزاج کے بعد قلب و زبان سے اس کے اقرار و تصدیق کے مرحلے سے گذر کر عملی میدان میں اس کا نفاذ بھی ہوتا ہے تو تب بات مکمل ہوتی ہے اور یہ مکمل اسوۂ حسنہ صرف محمد مصطفیٰ ﷺ کے پاس تھا جس نے ایک مکمل طور پر کامیاب جماعت اور معاشرہ بھی تیار فرمایا تھا جو سب کے لیے کل بھی' آج بھی اور ہمیشہ کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔

اس اسوۂ حسنہ کو قول و عمل کے توازن و اعتدال کے ساتھ قائم و دائم

رکھنے کا عظیم و بابرکت کام حضرات صوفیہ اور اصحاب طریقت نے انجام دیا ہے اور یہ صرف لفظ کی حرمت کے تحفظ سے ممکن ہوا' جہاں لفظ و معنی کے ساتھ ساتھ اقرار و تصدیق اور اس پر حسن عمل کارفرما ہے' لفظ کی اسی حرمت کو ملحوظ رکھنے کے لیے لفظ کے حروف میں جو اسرار و رموز ہیں ان پر توجہ مرکوز کرنے کے وسائل تلاش کیے گئے ہیں وسائل اسرار الحروف قرار پاتے ہیں' طالب و مرید توحید کے تقاضوں کو کیسے سمجھے اور پورا کرے کہ اس کی دنیا بھی کامیاب اور آخرت بھی سنور جائے؟ اس کے لیے مطلوب و مراد ہستیوں نے "توحید" کے حروف میں پنہاں اسرار و رموز عیاں کر کے اس توحید کو محض عقیدہ یا مسئلہ علم کلام کی حدود سے نکال کر میدان عمل میں ڈال دیا تاکہ طالب و مرید توحید کے حقائق و اسرار سے آگاہ ہو کر وہ قوت بن جائے جو صدق و امانت کا ثمر شیریں اور مظہر اتم ہو' پھر اس قوت کو نہ کوئی زیر کر سکتا ہے نہ شکست دے سکتا ہے بلکہ فتح و کامرانی اسی توحید کا مقدر ہے:

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا!!

عقیدۂ توحید شرف آدمیت کا عقیدہ ہے اور ایک قوت ہے جو غیر متزلزل اور ناقابل تسخیر ہے' جو گوشت پوست کے انسان کو ٹھوس چٹان میں بدل دیتا ہے' پھر اس چٹان سے جو بھی ٹکرائے پاش پاش ہو جائے خواہ فولادی شمشیر ہو یا زر و جواہر کا ڈھیر' ایسے موحد کا تصور تو شیخ شیراز دیتے ہیں کہ:

موحد چہ دریائے ریزی زرش
چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس
بریں است بنیاد توحید و بس!

ترجمہ: موحد تو وہ ہے کہ تم خواہ اس کے پاؤں میں زر و جواہر ڈال دو یا فولادی تلوار اس کے سر پہ رکھ دو اسے نہ تو دولت کی امید ہوگی نہ تلوار کا ڈر ہے' یہی تو ہے جسے توحید کی بنیاد کہتے ہیں؟

مگر اس کا اصل عملی نمونہ اسوۂ حسنہ نبوی میں ملتا ہے' جب قریش نے حضرت ابوطالب سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو باز رکھو تو ہم اس کے قدموں میں دولت کے ڈھیر اقتدار کی کرسی اور بلند نسب دوشیزہ سے شادی کرائے دیتے ہیں ورنہ ہم تلوار سے فیصلہ کروا لیں گے تو پیغمبر توحید ﷺ نے فرمایا تھا: اگر یہ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیں تب بھی اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں آؤں گا یا اس راہ حق میں کام آ جاؤں گا!!

تو یہ ہے توحید کا لفظ' اس کے معنی' اقرار اور تصدیق کے بعد معرکۂ عمل کا اصل نمونہ! ہم اگر توحید کو محض ایک مسئلہ علم کلام سمجھ کر بیٹھ جائیں تو اس میں اس عقیدے کا قصور نہیں اگر قصور ہے تو ہماری تعمیر شخصیت اور کردار سازی کے کارپردازوں اور ذمہ داروں کا' اسی لیے صوفی اور پیر طریقت نے اس کے اسرار حروف کی طرف متوجہ کر کے حقیقت توحید کو آشکار کرنا چاہا ہے کہ یہ پنج حرفی لفظ ہے (ت) سے مراد شرک و عصیان سے مکمل توجہ مراد ہے جو انسان کو ہر گناہ سے یوں پاک کر دیتی ہے جیسے وہ آج پیدا ہوا ہے۔ (و) وحدت کے لیے یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتراف اور وحدت نسل آدم کو تسلیم کرنا۔ (ح) حق کے لیے ہے حق پر ایمان' حق کے لیے جان اور حق کی ادائیگی کا عہد و پیمان (ی) سے مقصود رب ذوالجلال کی یاد کو ہر دم زندہ رکھنا ہے (د) عمل کے دوام کے لیے ہے' اپنے فرض سے کبھی غافل نہیں ہونا دائمی عمل کا سلسلہ جاری رکھنا ہے' اس سے توحید مکمل ہوتی ہے! یہی حروف توحید کے اسرار و رموز ہیں۔

ایک حکایت ہے جو حضرات طریقت و تصوف کے ہاں حروف لفظ کے اسرار سے اس کی معنوی گہرائی اور علم و عمل کے امتزاج کو ہر حال میں پیش نظر رکھنے کی حقیقت کو عیاں کرتی ہے' پیر طریقت سے بعض مریدین نے طویل خدمت و ملازمت کے بعد خلعت خلافت عطا فرما کر سند فراغ سے نوازنے کی درخواست کی تو آپ نے اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی (کیا انسان کو پتا نہیں کہ اللہ جل شانہ حاضر و ناظر سب کچھ دیکھتا ہے) کے چالیس روزہ ورد و ظیفے کا حکم دیا' چالیس روز

بعد سب کو ایک ایک مرغی اور چھری عنایت فرمادی کہ اسے کسی خفیہ جگہ ذبح کرلاؤ جہاں کوئی نہ دیکھتا ہو' سب ذبح کر لائے کہ حضرت سات پردوں میں ذبح کیا ہے جہاں کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا! ایک مرید بڑی تاخیر کے بعد واپس آیا' سب منتظر تھے دیکھا تو زندہ مرغی اور چھری ہاتھ میں ہے۔ آتے ہی عرض کیا: حضور! میں جب خفیہ مقام پر ذبح کرنے لگا تو خیال آیا کہ اللہ تو ہر جگہ دیکھتا ہے تو کیا اس سے مقصود صرف انسان تھے یا ذات باری بھی؟! سب مریدوں نے ساتھ ہی کند ذہنی پر غصہ کیا مگر شیخ نے کہا: سنو! تم سب فیل ہو گئے صرف یہ کامیاب اور خلافت کا حقدار نکلا ہے! جان لو! چالیس دن جو ورد وظیفہ کرتے رہے ہو اس کی معنویت اور اسرار حروف پر تمہاری توجہ نہیں تھی اس لیے تم کورے کے کورے ہی رہے۔

اہل طریقت کو اسرار حروف پر متنبہ و متوجہ کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تا کہ لفظ کے ساتھ معنی' اقرار' تصدیق اور عمل کے امتزاج سے کامیاب انسان تیار ہو سکیں مکہ مکرمہ کے دارارقم اور صفہ مسجد نبوی کی تربیت گاہوں کی سنت نبوی ﷺ کو زندہ و تابندہ رکھنے کی یہی عملی صورت تھی جسے ان بندگان حق نے قائم و دائم رکھا' سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ اسرار حروف کے حقیقی مرد میدان ہیں' لفظ کی حقیقت ذہن نشین کرانا اور اس کی حرمت کے تقاضے پورے کرنا صاحب ابیات باہو کا کمال ہے! اس کمال سے روشناس کرانے اور اسرار حروف کے باب کی گہرائی کے ساتھ گیرائی سے آگاہ کرنے کے لیے پروفیسر احمد سعید ہمدانی صاحب نے جس عقیدت' لگن اور محنت کے ساتھ حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے سمندر سے جواہر گرانمایہ سے مریدان باہو کے دامن کو مالا مال کر دیا ہے وہ قابل قدر' مستحق تحسین اور اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس کام کو شرف قبولیت سے نوازے اور خلق خدا کے لیے خیر کثیر بنا دے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

28-02-2003

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

اللہ تعالیٰ نے ''کُن'' کہہ کر کلام کیا اور اس سے پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا۔[1] پھر اسی نے انسان کو کلام اور بیان سکھایا:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ہ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ ہ (۵۵: ۳۴)

کلام سے بیان تک ترتیب کچھ یوں متصور کی جا سکتی ہے:

بے آواز کلام

آواز

حرف

لفظ

جملے (کلمات' بیان)

اوّل الذکر تو الہام والقاء سے متعلق ہے۔[2] اور کسی حد تک دوسرا درجہ بھی جو محض آواز ہے مگر یہ ظاہر میں معنی کے اظہار کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ آواز پھر حرف میں ڈھل گئی تا کہ سمجھ میں آ سکے۔ بعد ازاں آوازوں یا حرفوں کو ملایا

گیا تو لفظ بنے اور اُن کی ترتیب سے بیان پر تکمیل ہوئی۔

بیان کی فصیح و بلیغ مثال قرآن ہے جو عربی میں نازل ہوا:

"اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ آپ ﷺ کے دل پر اترا ہے کہ آپ ﷺ آگاہ کر دینے والوں میں سے ہو جائیں۔ صاف عربی زبان میں ہے۔ اگلے نبیوں کی کتابوں میں بھی قرآن کا تذکرہ ہے۔"

(۱۹۳-۶:۲۶)

"یقیناً ہم نے اُس کو قرآن عربی نازل فرمایا ہے کہ تم سمجھ سکو۔"

(۲:۱۲)

چونکہ اِس مقدس کتاب کے حروف تہجی عربی میں ہیں اور اگرچہ قرآن کے اندر اِن کا رفیع الشان مرتبہ اور ہے اور عام انسانی سطح پر تحریر و تقریر میں اِن کا درجہ اور ہے مگر اس کے باوجود حروف تہجی تو وہی ہیں۔ لہٰذا محققین و مفکرین اور صوفیاء و شعراء نے عقل و وجدان کے ذریعہ اِن کے ظاہر و باطن میں بھید جاننے کی کوشش کی اور بہت سی کام کی باتیں اِن پر کھلیں' ایک طبقہ تو اِس حد تک اِن پر غور و فکر میں منہمک ہوا کہ اِس سے تعلق رکھنے والے "حروفی" کہلائے۔

عربی کے حروف تہجی کی معروف تعداد ۲۸ ہے۔ اِن میں سے ہر ایک پرتاثیر اور قابل تصرف ہے اور حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں اس طرح ان کی ترتیب اور تعداد بیان فرمائی ہے:

حروف تہجی (۳)

تصور تصرف **ا** حاضرات کلید	تصور تصرف **ب** حاضرات کلید	تصور تصرف **ت** حاضرات کلید	تصور تصرف **ث** حاضرات کلید
تصور تصرف **ج** حاضرات کلید	تصور تصرف **ح** حاضرات کلید	تصور تصرف **خ** حاضرات کلید	تصور تصرف **د** حاضرات کلید
تصور تصرف **ذ** حاضرات کلید	تصور تصرف **ر** حاضرات کلید	تصور تصرف **ز** حاضرات کلید	تصور تصرف **س** حاضرات کلید
تصور تصرف **ش** حاضرات کلید	تصور تصرف **ص** حاضرات کلید	تصور تصرف **ض** حاضرات کلید	تصور تصرف **ط** حاضرات کلید
تصور تصرف **ظ** حاضرات کلید	تصور تصرف **ع** حاضرات کلید	تصور تصرف **غ** حاضرات کلید	تصور تصرف **ف** حاضرات کلید
تصور تصرف **ق** حاضرات کلید	تصور تصرف **ک** حاضرات کلید	تصور تصرف **ل** حاضرات کلید	تصور تصرف **م** حاضرات کلید
تصور تصرف **ن** حاضرات کلید	تصور تصرف **و** حاضرات کلید	تصور تصرف **ہ** حاضرات کلید	تصور تصرف **لا** حاضرات کلید
	تصور تصرف **ء** حاضرات کلید	تصور تصرف **ی** حاضرات کلید	

فرمایا:

"پس اے طالب! جاننا چاہیے کہ تیس حرف عرش اعظم کے آس پاس جو لکھے ہوئے ہیں۔ تو انہی تیس حروف سے تیس ہزار علم پیدا ہوئے ہیں...... علم ظاہری و باطنی اور معرفت ربانی سے اِن تیس حروف میں کوئی چیز باہر نہیں ہے......"(۴)

علماء و صوفیاو مفسرین نے سب سے پہلے تو قرآن مجید میں حروف مقطعات کو دیکھا اور ہر ایک پر اِن کی اپنی اپنی استعداد کے مطابق اِن کے تہہ در تہہ معانی کھلے......سورۂ فاتحہ کے بعد ہی سورۂ بقرہ الف۔ لام۔ میم سے شروع ہو رہی ہے۔ کہا گیا کہ ا سے اللہ، م سے محمد ﷺ اور ل سے جبرئیل علیہ السلام جو اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان قاصد ہیں۔ اسی طرح انتیس سورتوں کے ابتدائی حروف مقطعات ہیں، ہر حرف کے مطالب ہیں جو اِن میں پنہاں ہیں۔

صوفیاء کرامؒ نے سب سے پہلے معمولاً حروف تہجی کے اوّلیں حرف (ا) پر توجہ مرکوز فرمائی۔ الف اللہ کے مرتبہ احدیت اور وحدت و وحدانیت کا حرف ہے۔ یعنی یہ وحدت اور ماورائیت کی علامت ہے۔ گویا سب کچھ الف میں ہے اور الف ہی سب کچھ ہے۔ حضرت بلھے شاہؒ اپنی کلیات (ا سے شروع کرتے ہیں تو فرماتے ہیں:

ا اللہ رتّا دل میرا
مینوں ب دی خبر نہ کائی
ب پڑھیاں کجھ سمجھ نہ آوے
لذت الف دی آئی

پھر فرمایا:

اِکو الف پڑھو چھٹکارا ہے
اِک الفوں دو تِن چار ہوئے
پھر لکھ کروڑاں ہزار ہوئے
پھر اوتھوں باجھ شمار ہوئے

ہِک الف دا نکتہ نیارا ہے

....

علموں بس کریں او یار
اِکو الف تیرے درکار
علم نہ آوے وِچ شمار
اِکو الف تیرے درکار

مارٹن لنگز (ابوبکر سراج الدین) نے اپنی مشہور کتاب **A Sufi Saint of the Twentieth Century** میں شیخ احمد العلوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ الانموذج الفرید سے حروف تہجی کی علامات کے بارے میں تفصیل بیان کی ہے۔ یہ رسالہ ان دو احادیث کے ساتھ شروع ہوتا ہے: "جو کچھ آسمانی کتابوں میں ہے، وہ قرآن میں ہے اور جو کچھ قرآن میں ہے، وہ فاتحہ میں ہے اور جو کچھ فاتحہ میں ہے، وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہے"...... "وہ سب جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہے وہ حرف ب میں ہے اور وہ خود اُس نقطہ میں ہے جو اُس کے نیچے ہے۔" دراصل یہ احادیث پہلے حضرت عبدالکریم الجیلیؒ نے الکہف والرقیم کی شرح کی ابتداء میں نقل کی ہیں۔

شیخ احمد العلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر نقطہ نہ ہوتا تو نہ حرف ہوتا نہ لفظ نہ کتاب۔ نقطہ وہ پوشیدہ حقیقت ہے کہ حروف اُسی سے نکلے۔ سب سے پہلے (الف) کی شکل ظاہر ہوئی جو گویا ظہور اوّل ہے۔ الف گویا واحدیت کی علامت ہے۔ اوّل و آخر تمام اسی سے وابستہ ہوئے۔ اور تو اور ہ (ھا) کیا ہے؟ وہی الف کا جھکا ہوا انداز ہے اور م (میم) کیا ہے؟ (الف) کی گولائی ہے لیکن م نقاب بن گیا کہ اُس کی گولائی میں (الف) کی طرف دھیان نہیں جاتا۔

شیخؒ نے فرمایا: "علم کی حقیقت جو اُس کے مقام کے مطابق ہے، یہ ہے کہ تو (الف) کو ہر کتاب کے ہر لفظ میں آشکار دیکھے۔ سب کچھ الف ہی ہے۔"

پھر الف سے ب کا حرف بنا۔ اور صورت میں بسم اللہ کی ب مختلف ہے۔
اور یہ الف کی طرح کھڑی ہے۔ اصل میں لفظ تھا باسم مگر بسم بن گیا کیونکہ الف
نے اُس کے لیے جگہ خالی کردی۔ چنانچہ الف کا پورا ظہور ب میں ہوا گو الف اپنی
جگہ الف ہے اور ب اپنی جگہ ب ہی ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ ساری وحدت کے
باوجود عبد اپنی جگہ عبد ہے اور رب رب ہے۔ جب ب (انسان کامل ﷺ) نے
الف کے ساتھ اپنی نسبت سمجھ لی تو اُس نے وہ سب ذمہ داریاں پوری کیں جو اس
نسبت سے اُس پر عائد ہوئیں۔

اِن سب کے باوجود الف اپنی جگہ پر سب سے الگ اور بلند ہے گو
سارے حروف آخر میں اُسی سے ربط رکھتے ہیں۔ وَاِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا (اور اُس
کی انتہا تیرے رب کی طرف ہے) (۵)

اکو الف تیرے درکار

پھر الف سے کئی نکتے نکالے گئے۔ حروف ابجد کے لحاظ سے الف (ا
ل ف) کے اعداد بنتے ہیں ایک سو گیارہ۔ چنانچہ اللہ کے ا محمد ﷺ کے م اور علی
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ع کے اعداد بھی ایک سو گیارہ شمار کیے گئے۔

اسی طرح حروف ابجد کے اعداد کی ضرب تقسیم سے کسی بھی لفظ کا حاصل
اللہ اور محمد کے اعداد کے مطابق برابر ثابت کرکے دکھا دیا گیا۔ مثلاً اللہ کے حروف
کے اعداد ۶۶ ہیں۔ اب کوئی لفظ لے لیجئے مثلاً آدم۔ آدم کے اعداد بنیں گے ۴۵۔
ان کو دوگنا کردیں اور جمع کے بعد ایک بڑھادیں۔ یہ ہوجائیں گے ۹۱' دس کے
ساتھ ضرب دیں حاصل ضرب ہوگا۔ ۹۱۔ اس کو بیس پر تقسیم کریں تو بچیں گے دس'
ایک جمع کریں تو ہو گئے ۱۱' چھ سے ضرب دیں تو جواب آئے گا' ۶۶ جو اللہ کے
حروف کے اعداد ہیں:

عمل: آدم کے اعداد: ۴۵ — ۱: دوگنا کریں ۴۵+۴۵=۹۰
۲: ۹۰+۱=۹۱ — ۳: ۹۱x۱۰=۹۱۰

۴: ۹۱۰÷۲۰ =

۲۰) ۹۱۰ (۴۵
۸۰
۱۱۰
۱۰۰
۱۰

۵: ۱۰+۱ = ۱۱ — ۶: ۱۱x۶ = ۶۶

اسی ترتیب سے کسی لفظ کو لے کر بھی یہ عمل کریں گے تو جواب ۶۶ آئے
گا جو اللہ کے حروف کے اعداد ہیں۔

اب لفظ محمد ﷺ لے لیجئے۔ اس کے حروف کے اعداد ہیں: ۹۲۔ اس پر بھی
چھ درجوں میں یوں عمل کریں۔ مثلاً پھر لفظ آدم لے لیں۔ اعداد ہیں ۴۵۔ اب
ذرا عمل مختلف ہوگا:

عمل: آدم کے اعداد: ۴۵ — ۱: ۴ سے ضرب ۴۵ x ۴ = ۱۸۰
۲: دو جمع کیے ۱۸۰+۲ = ۱۸۲ — ۳: ۵ سے ضرب ۱۸۲x ۵ = ۹۱۰
۴۔ بیس پر تقسیم ۹۱۰÷۲۰ =

۲۰) ۹۱۰ (۴۵
۸۰
۱۱۰
۱۰۰
۱۰

۵: ۹ سے ضرب ۱۰x۹ = ۹۰
۶: ۲ جمع کریں ۹۰+۲ = ۹۲

چنانچہ محمد کے حروف کے اعداد ۹۲ ہیں۔
کوئی بھی لفظ لے لیں۔ حروف ابجد کے لحاظ سے اعداد جمع کریں۔ اور
اسی طرح عمل کریں گے۔ تو جواب اللہ یا محمد ﷺ کے اعداد کے مطابق ہوگا۔
خود حضرت سلطان باھوؒ کے نام کے حروف میں حکمت بیان کی گئی ہے۔
فرمایا: ''باھو با یک نقطہ یاھو می شوذ'' (باھو ایک نقطہ سے یاھو بن جاتا ہے) پھر
فرمایا: ''اسم باھو چیست یعنی کج وھاب'' (اسم باھو کیا ہے۔ الٹا وھاب ہے) وہاب

کے معنی ہیں: فیاض، بہت بخشنے والا، بہت عطا کرنے والا۔ بڑا دینے والا۔

پھر فقیر نور محمد مرحوم نے باہو کے اعداد ۱۴ لکھ کر اسرار بیان کیے۔ چودہ ۱۴ دن کے بعد چاند مکمل ہو جاتا ہے۔ کائنات کی سات انواع کو دگنا کیا جائے تو چودہ ہیں۔ چاند کی اٹھائیس تاریخ حروف تہجی کے اٹھائیس حروف بن جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ (۶)

اسی طرح حروف سے صوفی مزاج لوگوں نے فال ناموں کا کام بھی لیا۔ اس کے لیے دیوان حافظ اور قرآن مجید کے حروف کی جدول بنائیں اور اُن کے طریقے لکھے۔ یہاں اُس کا طریق مفصل بیان کرنے سے بہت طوالت ہوگی۔ مجملاً ترتیب کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے مثلاً ایک موضوع لے لیا جیسے امانت محفوظ رہے گی یا نہیں؟ اُس کے نیچے کوئی ۵ آیات لکھ دی گئیں جن سے ہاں یا نہیں کا اشارہ ملتا ہے۔ پھر اُنہی آیات کے لحاظ سے حروف کی خاص ترتیب سے نقشہ بنادیا گیا۔ کچھ پڑھ کر کسی ایک حرف پر انگلی رکھ دیں اور ہدایات کے مطابق حروف کو ترتیب سے لکھیں تو ایک آیت بن جائے گی۔ بس وہی جواب ہے۔

بالکل ایسی ہی ترتیب سے دیوان حافظ کے اشعار سے فال نکالنے کا طریقہ استعمال کیا گیا۔ قاضی سجاد حسین کے مترجم دیوان حافظ کے ساتھ فال کا طریقہ دیا گیا ہے۔ وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ (۷)

آگے چلئے۔ احد اور احمد کے درمیان م کا فرق ہے۔ م کے اعداد ۴۰ ہیں۔ چنانچہ ھاھوت سے ناسوت تک چالیس مراتب شمار کیے گئے اور اسی سے چالیس دنوں کے چلے کی بھی توجیہہ کی گئی۔

چونکہ الف سب حروف سے اوپر الگ کھڑا ہے۔ اس لیے تُرک صوفیوں نے ا کو مجرد و منفرد صوفی کی علامت متصور کیا۔

آگے جس قدر حروف ہیں، وہ گویا الف کی ہی لیٹتی، پھیلتی اور مڑتی ہوئی صورتیں ہیں۔ ب گویا عالم مخلوق ہے۔ اسی لیے ب سے بسم اللہ شروع ہو رہی ہے۔ ب کے نیچے نقطہ عالم میں حرکت کی ابتداء کی علامت ہے۔ قرآن مجید بھی

ب سے شروع ہوتا ہے اور س پر ختم ہوتا ہے۔ ملا کر پڑھیں تو بنتا ہے "بس" یعنی کافی مکمل، سب کچھ اس کے اندر آ گیا۔

حروف میں ھ پر خاص طور پر دھیان دیا گیا۔

ھو اسم ذات ہے، یہ ھ سے شروع ہو رہا ہے۔ اسی ھا سے اللہ کی ھویت کا ظہور ہو رہا ہے۔ سلطان العارفینؒ کا رسالہ روحی بھی حکماء و صوفیا کی چند اصطلاحات کی طرف اشاروں کے بعد اسی ھا سے شروع ہوتا ہے۔ "ذات سرچشمہ چشمان حقیقت ھاھویت، حضرتِ عشق" (حقیقت ھاھویت کی آنکھوں سرچشمہ حضرت عشق) (۸)

اصطلاحاتِ صوفیہ میں "ھا سے مراد ذات حق سبحانہٗ باعتبارِ ظہور ہے۔" (۹)

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تصور کے مراقبہ کو اوّلیت و اہمیت دی گئی ہے۔ سب سے پہلے تصور اللہ اسم ذات ہے۔ ڈاکٹر اَنے ماری شمل نے خواجہ ناصر محمد عندلیب دہلویؒ کی حروف کے تصور کے حوالے سے ہدایات نقل کی ہیں (۱۰) جو ہر ایک کے لیے مفید مطلب ثابت ہوسکتی ہیں...... اللہ کے نقش پر نظر جمانے کے بعد صاحب تصور آنکھیں بند کر کے مراقبہ کرے تو جب بھی وہ اپنے تئیں ا اور ل کے درمیان پائے تو پھر اُسے آگے بڑھ کر دونوں ل کے درمیان جگہ بنانی چاہیے اور پھر ل اور ھ کے درمیان۔ یہاں سے ہمت کے بل بوتے پر اُسے اپنے تئیں ھ کی آنکھ میں دیکھنا چاہیے۔ پہلے پہل شاید وہ صرف اپنا سر اس کے اندر پائے مگر بتدریج وہ اپنا پورا وجود اس خانے کے اندر پائے گا اور ہر قسم کی آزمائشوں اور بلاؤں سے نجات پاکر وہاں قرار پکڑے گا۔ یوں صاحب مراقبہ کے لیے یہ آخری درجہ ہے جہاں ھ کا نور اس کو اپنے احاطے میں لے لے گا۔ (۱۱)

صوفیاء کرام نے اپنی اصطلاحات کو سمجھانے کے لیے اکثر سی حرفی کا انداز اختیار کیا۔ اس میں نہ کوئی پیچیدگی تھی نہ مشکل مگر سننے اور پڑھنے والوں کے

لیے بات کو ذہن نشین کرنا آسان ہو جاتا تھا۔ اس طریق سے انہوں نے عام طور پر فقیری اور درویشی کی ظاہری و باطنی واردات' مشاہدات و تجربات اور احوال و مقامات سب بیان کردیئے۔ ڈاکٹر اَنے ماری شمل نے دسویں صدی کے صوفی ابوالقاسم حکیم سمرقندی کے ہاں سے یہ مثال دی ہے:

نماز : ن سے نصرت
م سے مِلک
ا سے الفت
ز سے زیادہ

بکتاشی صوفیا کے ہاں طریقت کی حروف کے حوالے سے یوں شرح بیان کی گئی۔

طریقت: ط سے طلب حق
ر سے ریاضت
ی سے یار طریقت سے وفاداری
ق سے قناعت
ت سے تسلیم تام (۱۲)

حضرت عبدالکریم الجیلیؒ اور شیخ الاکبر محی الدین ابن عربیؒ نے بھی اکثر یہ طریقہ استعمال کیا اور یوں تمام مسلمان ملکوں کے صوفیا نے اس طریقہ کو تفہیم کے لیے منتخب کرلیا۔ چنانچہ حضرت سلطان العارفینؒ نے اپنی کتب میں اس طریق کو کمال تک پہنچادیا ہے۔

کچھ اہل نظر نے قرآن مجید میں حروف تہجی کے استعمال میں باطنی بھیدوں کا مشاہدہ کیا اور دیکھا کہ انسانوں کی زبان میں اِن کی حکمت الگ ہے مگر اللہ کے کلام میں یہ سب اپنی اپنی جگہ پہ اسرار کا مخزن بن گئے ہیں۔

حروف مقطعات کا معاملہ تو راز تھا ہی' حروف تہجی بھی راز ہی راز ہیں مگر

اِن کو صرف اصحاب مشاہدہ ہی جان سکتے ہیں۔

یہاں تک بات اُن کے مشاہدے میں آئی کہ زبر' زیر' پیش بھی انوار کا مظہر دکھائی دیئے۔ جیسے ''ذکوریت پیش کے لیے اور کمال صورت ظاہری زبر کے لیے اور کمال عقل زیر کے لیے اور کمال حس باطنی جزم کے لیے'' وغیرہ وغیرہ۔ نیز حضرت سیّد عبدالعزیز دباغ نے جو اپنے وقت کے غوث تھے۔ حروف کو انوار باطنیہ پر تقسیم کیا جیسے

ت ظ م ص ع	آدمیت کے لیے
ء ث ش ہ	قبض کے لیے
ر ن س	بسط کے لیے
ج ح ک ص ع ی	نبوت کے لیے
خ د ط ق ہ	روح کے لیے
ذ ف	علم کے لیے
ب ز ل و	رسالت کے لیے

اور وضاحت فرمادی کہ ''حروف کی یہ تقسیم صرف قرآن مجید کے حروف کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی اور کلام کے حروف کے لیے ثابت نہ ہوگی۔'' اس طرح علم اسرار الحروف کشفی علوم میں سے ہے اور سوائے ''اہل عرفان وشہود وعیان'' اور کوئی نہیں جان سکتا۔ (۱۳)

حضرت سلطان العارفین سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ ان تمیں حرفوں سے تمیں ہزار علوم پیدا ہوئے ہیں ''اور ان علموں کو سوائے حضور محمد ﷺ کے کوئی نہیں جانتا ہے۔ پس علم کشف اور علم معرفت اور علم لدنی کسی کو بغیر اجازت حضور محمد رسول اللہ ﷺ حاصل نہیں ہوتا اور نہ بغیر مطالعہ حروف عرش کے کسی کو حاصل ہوتا ہے۔'' (۱۴)

حضرت سلطان العارفینؒ نے کشف سے ان حروف کے اسرار کے علم کے لیے کسی مرشد کامل کے پاس جانے کی ہدایت کی ہے۔ جو ہر ایک حرف کے لیے

تصور و تصرف سکھا سکتا ہے اور پھر تاثیر میں یہ رواں ہو جاتے ہیں۔

حضرت سلطان باھو نے بھی حضرت سیّد عبدالعزیز دباغ کی طرح سات سات حرفوں کی تقسیم کی ہے اور تصرف کی رُو سے اِن کے مقاصد دعوت بیان فرمائے ہیں مگر زیادہ تفصیل بیان نہیں کی۔ اس قدر شرح فرمادی کہ ''ان سات حرفوں سے وحدانیت کے تین بھید کھلتے ہیں اور معرفت کی پہچان ہوتی ہے: ا ب ت ث ج ح خ

''حرف الف سے تو اللہ جان...... تو جان لے کہ علم کا ایک حرف الف ایسا ہے جس کے پڑھنے سے پڑھنے والا واصل ہو جاتا ہے......

''دوم حرف ب ہے کہ تمہارے لیے اللہ کافی ہے......

''سوم حرف ت ہے کہ بندہ موحد توکل کرنے سے ہی ہوسکتا ہے۔

''چوتھا حرف ث ہے' ث سے ثابت قدم......

''پانچواں حرف ج ہے' اس سے مراد جہالت سے نکالنا ہے......

''چھٹا حرف ح ہے' حرص کو ترک اور حیرت اختیار کرا دیتا ہے......

''ساتواں حرف خ ہے' وجود میں خوئے خودی زائل ہو جاتی ہے......''(۱۵)

دراصل حروف کے تصور اور اِن کے اندر پوشیدہ قوتوں (حاضرات) کو زیرِ تصرف لانے کے لیے بھی مراقبات کا ایک سلسلہ ہے جو کوئی عامل مرشد ہی سکھا سکتا ہے۔ ''ان تیس حروف سے کوئی چیز باہر نہیں ہے لیکن مرشد اور استاد کامل چاہیے۔''(۱۶)

فرمایا:

''تیس حروف سے کل و جزو کے حاضرات قبضۂ قید اور تصرف میں آتے ہیں' تیس حروف گویا قرآن شریف کے تیس سیپاروں کی چابیاں ہیں تیس حروف سے تیس علم' تیس حکمتیں' تیس خزانے' تیس دائرہ نقش' تیس حاضرات معلوم ہوتے ہیں۔ کلیہ حروف کے بعض حاضرات سے ماضی' حال اور استقبال کے حالات' مقامِ ازل' مقامِ ابد' مقامِ عقبےٰ مقام

معرفت توحید الٰہی معلوم و حاصل ہوتے ہیں۔ دائرہ نقش کے حاضرات سے تجلیات ذاتی کا مشاہدہ ہوتا ہے......''

ایسا شخص فقیر کامل ہوتا ہے جیسے خود حضرت سلطان صاحب تھے:

''جو شخص کلیدات حاضرات کے اِن مراتب پر پہنچتا ہے' فقیر لایحتاج ہوجاتا ہے۔ جہان بھر کی ساتوں ولایتیں اور ساتوں بادشاہ اُس کے مرید ہو جاتے ہیں...... تیس حروف کی برکت و جمعیت سے اٹھارہ ہزار قسم کی مخلوق' مؤکل فرشتے باہر نہیں۔''(۱۷)

ظاہر ہے کہ یہ وہ اسرار ہیں جو صرف فقراء پر اپنے اپنے مراتب کے مطابق کھلتے ہیں۔ پھر اِن کا تعلق کشف و نظر سے ہے' محض علمی بیان یا ڈھکوسلوں سے سمجھ میں نہیں آسکتے۔

ہم اس کتاب میں اسرار الحروف کی صرف وہ قسم ملاحظہ کریں گے جو سی حرفی کے طور پر بیان میں آتی ہے۔ ہر حرف کسی نہ کسی قدر' خوبی' مشاہدہ' تجربہ یا علمی نکتہ کی طرف اشارہ کا کام دیتا ہے۔ سلطان العارفین نے ہمارے ہاتھ میں اسرار حروف کی کلید دے دی اور یہاں علم کی حد تک فقر و تصوف کے بعض خزائن معرفت تک رسائی کے لیے دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ آگے خزانے تک ہاتھ کس کا پہنچتا ہے۔ یہ سب پھر سلطان صاحبؒ کی نظر کرم پر منحصر ہے۔ اللہ ہم سب کو رشد و ہدایت عطا فرمائے اور ''نور توفیق'' بخشے!

سیّد احمد سعید ہمدانی

نوشہرہ (وادیٔ سون)

۲۰ جولائی ۲۰۰۱ء

✿......✿......✿

الف ا

اِعتقاد

''طالب وہ ہے جو مرشد سے صرف اعتقاد طلب کرے اور اعتقاد اُسے کہتے ہیں کہ اعتقاد میں شیطان اور نفس کی جانب سے کسی قسم کا فساد پیدا نہ ہو۔
اعتقاد کے چھ حروف ہیں:

اع ت ق اد

حرف ا سے آئینہ دل صاف ہو جائے۔
حرف ع سے عین دیکھے اور عین بخشے۔
حرف ت سے ہر دوسرا کو طے کی توفیق حاصل ہو۔
حرف ق سے قوت قربِ اللہ حضوری بخشے۔
حرف ا سے ارادہ صادق رکھے۔
حرف د سے دوام مجلس حضرت محمد رسول اللہ ﷺ۔

کسی مرشد سے اگر (مرید پر) یہ جملہ مراتب کھل جائیں تو وہ اعتقاد بخشنے والا مرشد ہوتا ہے۔'' (نور الہدیٰ فارسی مرتبہ فقیر نور محمد' ص ۷۵)

اعتقاد کے لغوی معنی ہوتے ہیں: یقین کرنا' گرویدہ ہونا' ایمان لانا وغیرہ اس میں حروف کے حوالے سے چھ خصوصیات یہ ہیں:

آئینہ دل صاف

دل کو صوفیاء کرامؒ نے جذبہ و احساس اور کشف و وجدان کا مرکز متصور کیا ہے۔ کوئی بھی برائی کا خیال آتا ہے' کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے' کوئی جذبہ برائی پر

اکساتا ہے یا منفی احساس کی صورت پیدا ہوتی ہے تو دل میلا ہو جاتا ہے یعنی پھر اس کا کہیں اثر ہی صحیح ہوتا ہے نہ اس کا کوئی تاثر درست ہوتا ہے۔ باطن کا تو یہ حال ہے' اُدھر ظاہر کا ماحول بھی احساس و وجدان کی اس قوت یعنی دل کو صفائی سے محروم کردیتا ہے جیسے بری صحبت و مجلس' برائی کی جگہوں پر سیر و گردش' قیام یا رہائش اور بداعمالی و بدخصالی وغیرہ۔

آئینہ دل صاف ہوتا ہے شریعت پر عمل کرنے سے' ذکر سے' نیک صحبت سے' درویشوں اور نیکوکار لوگوں کے ساتھ مسجدوں' خانقاہوں اور مقاماتِ کار و خدمت میں قیام اور کام کرنے سے۔ یا پھر یوں کہئے کہ سب سے بڑھ کر مرشد کی زیرِ نگرانی عمل پیرا رہنے سے' خواہ وہ عمل دین کا ہو یا دنیا کا۔

تب آئینہ دل پر ایک نور چمکتا ہے تو کردار اور شخصیت روشن ہو جاتے ہیں' علم کے غیبی ذرائع بروئے کار آتے ہیں' کشف اور الہام کے ذریعہ حقائق کھلنے لگتے ہیں اور سب کچھ اس دل کے اندر نظر آنے لگتا ہے...... اس حالت میں شاعر اور صوفی دل کو جامِ جمشید کہتے ہیں کہ گوناگوں جہاں اس آئینے میں دکھائی دیتے ہیں۔

عین دیکھے اور عین بخشے

صاف دل بندہ جب حیات و کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو حقائق اپنی اصلی حالت میں اُس کو نظر آتے ہیں۔ عام طور پر آدمی کی نظر ظاہر پر ہی ٹھہر جاتی ہے۔ ظاہری فائدے' ظاہری چمک دمک اور ظاہری خوبصورتی کے پیچھے چھپے ہوئے نقصانات' سیاہیاں یا سیاہ کاریاں اور ہر قسم کے داغ دھبے' اوجھل رہتے ہیں۔ شریعت اور طریقت پر عمل کرنے سے آدمی کو ایسی فراست حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقت کو بعینہٖ ایسا ہی دیکھتا ہے جیسی کہ وہ ہے۔ اسی کو عین دیکھنا کہتے ہیں۔ اس سے اگلا درجہ یہ ہے کہ ہر چیز کے پیچھے اللہ کو دیکھے اور پھر اُسے ہر طرف اللہ ہی اللہ دکھائی دے۔ عین بخشنا یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو بھی اس حقیقت کی نشاندہی کر سکے۔ مگر یہ مرحلہ تب آتا ہے جب مرید ارشاد کے مقام پر پہنچ جائے یعنی مرشد

کی طرف سے صاحب اجازت مرشد متعین ہو جائے۔

ہر دوسرا کو طے کرنے کی توفیق

فقیری کے طریق میں دونوں جہان سے گذر کر اللہ سے لو لگائی جاتی ہے۔ لہٰذا اب جو کام ہوتے ہیں وہ اِن جہانوں سے آگے عشق الٰہی کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کیئے جاتے ہیں۔ اب ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس غرض کے لیے حالات موافق ہو جائیں یعنی رکاوٹیں دُور ہوتی جائیں، کوششیں بار آور ہوں اور ریاضت و عبادت سے مثبت نتائج پیدا ہوں۔ یہ توفیق ہے۔ حضرت سلطان العارفین سلطان باہوؒ نے اِسے بعض مقامات پر "نورِ توفیق" کہا ہے۔ یہ نورِ توفیق مرشد کی دعا اور ہدایت سے حاصل ہوتا ہے۔ جب مرشد کہتا ہے: "اَرْشَدَکَ اللّٰہُ فِی الدَّارَیْنِ" (اللہ تعالیٰ تجھے دونوں جہان میں رُشد عطا کرے) تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ فقیر کے سامنے امکانات کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ دونوں جہانوں کے مفادات سے بلند ہو کر ذاتِ الٰہی سے تعلق جوڑ لیتا ہے۔ یہ ہوتی ہے ہر دوسرا کو طے کرنے کی توفیق!

قرب اللہ حضوری کی قوت

صوفیاء کرام کو مقربین بھی کہا گیا ہے یعنی یہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے درپے رہتے ہیں یہ قربت ذکر و عبادات سے حاصل ہوتی ہے۔ اس قربت کی بڑی نشانی یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اپنے آپ کو اللہ کے سامنے حاضر و ناظر سمجھ کر عمل پیرا ہو۔ حدیث جبریل علیہ السلام میں اسی کو درجہَ احسان کہا گیا ہے۔ یعنی بندہ اس طرح عبادت کرے گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے یا خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔ مگر اس درجہ پر فائز ہونے کے لیے بھی ایک طاقت درکار ہے۔

اس قوت کو بھی اعتقاد کی خصوصیت کہا گیا ہے۔ مرشد مرید پر جذب کی ایسی حالت طاری کر دیتا ہے کہ توجہ ایک مرکز پر آ جاتی ہے۔ بندہ ذکر و فکر الٰہی میں

محو ہو کر کام کرنے لگتا ہے جیسے عام ضرب المثل میں کہا گیا ہے۔ دست در کار، دل بایار۔

صدق ارادہ

صحیح اعتقاد کی علامت یہ بھی ہے کہ نیت میں اخلاص ہو اور ارادہ سچا ہو۔ بندہ یہ طے کرلے کہ اب اُسے بہرصورت قرب کے اُس مقام پر پہنچنا ہے جو امر الٰہی کی رُو سے اُس کے لیے مخصوص ہے۔ کسی ریاکاری یا منافقت یا جھوٹ اور فریب کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہ برائیاں بعض اوقات ایسا روپ دھار لیتی ہیں کہ بندہ اِن کی تاویلیں کرنے لگتا ہے۔ صدق ارادہ یہ ہے کہ برائی کو برائی سمجھے اور یکسوئی و راستی کے ساتھ آگے بڑھتا جائے۔

دوام مجلس محمدی ﷺ

جب بندہ شریعت کے جائز و ناجائز، حلال و حرام اور امر و نہی کو جان کر عمل پیرا ہوگا تو اُسے یقیناً احساس ہوگا کہ یہ سب کچھ وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق کر رہا ہے۔ گویا وہ وہی کر رہا ہے جو خود رسول اللہ اور ان کے اصحاب نے کیا۔ اُس کا یہ احساس اُس کو رسول کریم ﷺ کی مجلس میں لے جائے گا جہاں سے یہ سارے احکامات جاری ہوئے۔

مجلس محمدی میں حضوری حضرت سلطان العارفین سلطان باہوؒ کے سلوک میں ایک مراقبہ بھی ہے جو مرشد کی زیرنگرانی کیا جاتا ہے کچھ عرصہ ایسا کرنے سے فقیر واقعی مجلس محمدی ﷺ میں حضوری کا شرف حاصل کرلیتا ہے۔

جیسا کہ متن سے ظاہر ہے، اعتقاد کی یہ خصوصیات مرشد کے حضور میں حاضر ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ صوفیاء کرامؒ نے مرشد کی مریدی پر اس لیے زور دیا ہے کہ مرشد کی صحبت و مجلس اور دعا و برکت سے اعتقاد قوی ہو جاتا ہے۔ یہ سب خوبیاں تجربات و واردات کے طور پر ظاہر ہو کر اعتقاد کو مصفّٰی و مکمل کر دیتی

ہیں۔

اللہ

"سنو! اسم اللہ میں چار حرف ہیں اور اس میں چار ہی ملک ہیں۔ یعنی ازل، ابد، دنیا اور عاقبت۔ جس شخص کا دل اسم اللہ سے روشن ہو جاتا ہے۔ اُس کا دل جامِ جہاں نما ہو جاتا ہے۔ اُس کا آئینہ قلبی صاف ہو جاتا ہے اور اُس میں اُسے اٹھارہ ہزار قسم کی مخلوق نظر آنے لگتی ہے۔ احدیت تک پہنچ جاتا ہے۔

حرف ا سے ازوست

ل سے ملک لانہایت

ل سے لامکان

ہ سے ہدایت مراد ہے۔

جس کی حالت اس کے مطابق نہیں ہوتی گویا اسم اللہ کی تاثیر نہیں ہوتی اور اسم اللہ کی اُسے خبر ہی نہیں۔" (جامع الاسرار اردو ترجمہ ص ۲۸)

جب طالب حق مرشد کی خدمت میں پہنچتا ہے تو اللہ کا نام لے کر اُس سے پڑھنے اور سیکھنے کی ابتداء کرتا ہے اور مرشد بھی اُسے اللہ اللہ کرنا ہی سکھاتا ہے یعنی اللہ کا ذکر کیسے کیا جاتا ہے۔ لیکن ذکر سے پہلے اللہ کے بارے میں عقیدہ درست ہونا چاہیے۔ حروف کے حوالے سے یہ نکات ذہن نشین ہونا لازمی ہیں۔

ازوست (سب کچھ اُسی سے)

بندۂ حق کو جان لینا چاہیے کہ سب کا خالق بھی اللہ ہے اور پوری کائنات کا کارساز و کار پرداز بھی اللہ ہی ہے۔ یہاں بعض قارئین کا ذہن ہمہ اوست اور ہمہ ازوست کے فلسفیانہ نکات کی طرف بھی منتقل ہوسکتا ہے مگر جیسا کہ متن سے ظاہر ہے سلطان العارفین ان میں الجھانے کی بجائے صرف یہ تلقین فرماتے نظر آتے ہیں کہ ہر معاملے میں نظر اللہ پر رہنی چاہیے۔ یہی توحید ہے اور یہی تسلیم و

رضا ہے۔ کہ ہر چہ از دوست آید خوش است یا جیسا کہ فرمایا: "ہمہ از وست در مغز پوست" (مغز و پوست میں سب کچھ اُسی کا ہے)۔

ملک لانہایت

اللہ کی بادشاہی کی کوئی حد نہیں اور اس سے کائنات کے بارے میں بھی یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جہاں اللہ کی بادشاہی ہے، اُس کی بھی کوئی حد نہیں۔ اُس کی ذات بھی لامحدود، اُس کی صفات بھی بے حد و حساب اور اُس کی بادشاہی بھی لامحدود۔ درویش کی فکر جب اس نکتے پر مرکوز ہوتی ہے تو سوائے اُس کے کہ وہ پکار اٹھے "اللہ ہی اللہ" اور کچھ نہیں کرسکتا ہے۔ آگے حد ادب ہے!

لامکان

اُس کی ذات کیسے سمجھ میں آئے جب کہ ہم وقت اور مکان کے تصور کے بغیر کسی شے کے وجود کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ یہیں تو حکیم شاعر پکار اُٹھا تھا:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں (اقبال)

مفکر عارف کو یہ تو معلوم ہے کہ وہ ذات جو لامکان ہے دنیائے مجاز میں تو نظر آنے سے رہی، دراصل وہ اس عالم میں اُس کی تجلی کا خواہاں ہے کہ وہاں تک ہر ایک کی رسائی ہوسکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ "لباسِ مجاز" تجلی کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوگا۔

بہرصورت عقیدے کی رو سے ایمان لازم ہے کہ وہ ذات الٰہی کسی مکان میں مقید و محدود نہیں۔

ہ سے ہدایت

یہ بھی ایمان کا حصہ ہے کہ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے آئے اور اللہ کی طرف سے ہدایت پیغمبروں اور فرشتوں کے ذریعے ملتی ہے۔ شرائع رسول

لاتے رہے اور اِن شرائع کی مطابقت میں کشف اسرار کا سلسلہ ولیوں کے ذریعہ جاری رہا اور رہے گا۔ اِس لحاظ سے انبیاء و رُسل اور اولیاء اللہ صاحب ہدایت ہوتے ہیں۔

اللہ نے اپنے رحم و کرم سے ہدایت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ آج بھی جہاں کوئی ہدایت کا خواہاں ہوتا ہے۔ اللہ کسی نہ کسی صاحب ہدایت ولی یا فرشتے کے ذریعہ یا کسی بھی غیبی طریق پر اُس کی امداد کا سامان کر دیتا ہے۔

اس سے پہلے فرمایا کہ اللہ کے چار حروف ہیں اور چاروں ملک اسم اللہ ذات کے اندر ہیں۔ یعنی ازل اور ابد جس کے شروع یا آخر کا ہمارے پاس کوئی تصور نہیں۔ اور یہ دنیا اور آخرت جن کا ہم قلیل سا تصور رکھتے ہیں سب پر اسم اللہ محیط ہے۔

جو شخص اسم اللہ ذات کے ذکر سے نور پالیتا ہے' اُس پر اُن چاروں ملکوں (ازل و ابد اور دنیا و آخرت) کا حال بھی روشن ہو جاتا ہے اور وہ اپنی استعداد کے مطابق کچھ نہ کچھ ذات و صفات کے بارے میں بھی جان لیتا ہے اور پھر وہ اُس مقام کو پالیتا ہے جہاں وہ فائز ہو کر حاضر و ناظر ہو جاتا ہے۔ یہ سب معرفت اور مقامات اسم اللہ ذات کے تصور اور ذکر سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے لیے کسی مرشد سے رہنمائی اور نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

✿.....✿.....✿

ب

ب: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اور ب سے بنائے اسلام ہے اور بنائے اسلام میں مسلمانی تمام ہے۔"

(محک الفقر کلاں اردو ترجمہ ص ۱۹۰)

متن میں حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ کی جو "حضرت پیر دستگیر' زندہ جان' روشن دین' عارف باللہ' حق الیقین' شاہ محی الدین قدس اللہ اسرارھم کہ خاتم اولیاء ہیں اور خاتم الفقراء اور خاتم المعروف اور خاتم الولایت اور خاتم الہدایت اور خاتم العنایت ہیں" تعریف فرما رہے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظم کو یہ مراتب اس لیے حاصل ہوئے کہ "قدم حضرت پیر کا شریعت پر ہے کہ شریعت میں ایک حرف سے حضرت پیر کو تمام شرف حاصل ہے۔ اور وہ حرف ب ہے۔"

بنائے اسلام

بنائے اسلام شریعت ہے اور شریعت کی بناء کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہیں۔ اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی نسبت براہ راست محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ سے ہے۔ اسی لیے شیخ عبدالصمد زعزمی نے اس کی تشریح یوں کی ہے:

"ماسوا اللہ ہر شے کی ابتداء ب سے ہے کیونکہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی ابتداء بھی ب ہی سے ہے۔

"قرآن پاک کا ماحصل سورۂ فاتحہ میں ہے۔ سورہ فاتحہ کا ماحصل بسم اللہ میں اور بسم اللہ کا ب میں اور ب کا ماحصل اُس کے نقطہ میں ہے کیونکہ بسم اللہ میں پروردگار کا اپنا نام آتا ہے۔ اسی لیے ب میں اور نتیجتاً اُس کے نقطہ میں اسم الٰہی

موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی خلق سے نہ تو جدا ہے نہ اُس میں شامل ہے۔ نقطہ دراصل نقطۂ تخلیق ہے اور اس کی نسبت سیّدنا رسول اللہ ﷺ سے ہے۔"(۱)

حضرت شیخ عبدالکریم الجیلی رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے ذاتی عرفان میں منفرد مانے گئے' بعض عارفین کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم عارف کی زبان سے ادا ہو تو وہ ایسے ہے جیسے اللہ نے کن کہا۔ شاہ وہاج الدین نے اُس کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے: "پس انسان کامل جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے تو عالم کو پیدا کرتا ہے۔" گویا سب کچھ اُس نقطۂ تخلیق سے ظہور میں آ رہا ہے جو "عقل کل" اور "نفس کل" کا جامع ہے۔(۲)

شیخ الجیلیؒ نے کئی معارف لکھنے کے بعد فرمایا کہ ا کو پھیلا دیں تو یہی آگے ب ہے۔ چنانچہ "اسی طرح حقیقت محمدیہ ﷺ یہ ہے کہ تمام عالم اُس سے پیدا کیا گیا ہے جیسا کہ حدیث جابرؓ میں وارد ہے کہ اللہ نے روح نبی ﷺ کو اپنی ذات سے پیدا کیا اور تمام کائنات کو روح محمدی ﷺ سے پیدا کیا۔ پس محمد ﷺ ہی ظاہر فی الخلق ہیں اپنے اسم سے بمظاہر الٰہیہ۔"(۳)

جس طرح "ب ہی کل اعداد میں جاری و ساری ہے۔" اسی طرح حقیقت محمدیہ ﷺ کونین میں سرتا سر جاری و ساری ہے۔

ب بسم اللہ

ب بسم اللہ اسم اللہ دا ایہہ بھی گہنا بھارا ھو
نال شفاعت سرور عالم چھٹسی عالم سارا ھو
حدوں بے حد درود نبی نوں جیں دا ایڈ پسارا ھو
قربان تنہاں توں باھو جنہاں ملیا نبی ﷺ سہارا ھو

بسم اللہ!
بسم اللہ ہی اللہ کا اسم ہے۔
یہ بھی ایک بھاری زیور ہے۔

(جان لو!) سرور عالم کی شفاعت سے
سارا جہان بخشا جائے گا!
بے حد درود نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر
جن کی روحانی حقیقت
سب جہان پر پھیلی ہوئی ہے
باھو! میں ان پر سے قربان جاؤں
جنہیں
اس برکت والے نبی ﷺ کی
حضوری نصیب ہوئی)

بعض صوفی غیر اسلامی سریت پسندوں کے زیر اثر یہ خیال کرنے لگے کہ بس اللہ اللہ ہی کافی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے احکام اضافی اور ضمنی باتیں ہیں سلطان صاحبؒ ان کی پہلی بات کا اثبات کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اللہ کا نام لینا بڑی بات ہے لیکن صرف یہی کافی نہیں۔ تم سب کچھ کر لو گے مگر بشری کمزوریوں کی بناء پر اذکار و اعمال میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ضرور رہ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے اِن تقصیرات کے نتائج سے لوگوں کو تحفظ عطا فرمائے گا۔

محمد ﷺ کی حقیقت اور فضیلت کو سمجھ لینے سے ہی یہ بات فہم میں آ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب "کن" کہا۔ یعنی "ہو جا!" تو سب سے پہلے حقیقت محمدیہ ﷺ ظاہر ہوئی (نُوْرٌ مِنْ نُوْرِاللّٰه) اور جب وہ پھیلی تو کائنات وجود میں آ گئی...... پھر آپ رحمۃ اللعالمین ہیں اور اس رحمت نے بھی سب جہان کا احاطہ کر رکھا ہے کہ یہ رحمت اپنی اصل میں وہی الٰہی رحمت ہے۔ وسِعَتْ رَحْمَتِیْ کُلَّ شَیْءٍ (۷-۵۶) (اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو) سلطان صاحب فرماتے ہیں۔ جس نبی رحمت کی فضیلت کی وسعت یہ ہو۔ اسی سے ہمیں قرب کے مقامات حاصل ہوں گے۔ وہ لوگ بہت قابل قدر ہیں جنہیں رحمۃ اللعالمین ﷺ کی حضوری

حاصل ہوگئی۔ وہ دونوں جہان میں فلاح پاگئے۔

اس بیت میں ان ملاحدہ کا بھی رد ہے جو صرف حقیقت مطلقہ Ultimate Reality پر یقین رکھتے ہیں اور محض فکر کی سطح پر اُس کا ادراک چاہتے ہیں۔ وہ خود اُن کے اطمینان کے لیے تو شاید کافی ہو مگر درحقیقت یہ اُن کی محدود عقل کی بے سود دوڑ ہے۔ اس حقیقت کی معرفت کے لیے بھی رسالت کے اقرار سے بے بہرہ ہو کر کسی منزل تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ رسالت و نبوت محمدیہ سے مستفیض ہو کر مردانِ راہ کسی منزل تک پہنچ پاتے ہیں۔ محض نجات اور بخشش کے لیے بھی نبی کریم ﷺ کی شفاعت کے بغیر چارہ نہیں۔ (۴)

❁.....❁.....❁
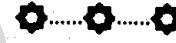
پ

پ سے پیر

پ: ''پیر کے تین حرف ہیں:

۱- حرف پ سے مراد یہ ہے کہ وہ طالبوں اور مریدوں کو اس طرح پاک و صاف کرے جس طرح نہلانے والا میت کو۔

۲- حرف ی سے یہ مراد ہے کہ وہ مرید کی اس طرح مدد کرے۔ جس طرح مردے کی نماز جنازہ کے وقت کرتے ہیں۔

۳- ی سے مراد یہ ہے کہ اُس پر ازل و ابد کے راز منکشف کرے تاکہ منکر نکیر کے سوال و جواب میں اُسے آسانی ہو اور نفس اور شیطان سے بچ جائے۔

جس پیر میں یہ علامات نہیں' اُس سے ہرگز ملاقات نہیں کرنی چاہیے۔''

(جامع الاسرار ص ۱۶)

پیر پاک و صاف کرے

بعض اوقات سرسری نظر سے صوفیاء کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ کرنے والے دانش ور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ایک پیر و مرشد بھی دوسرے شعبہ ہائے علوم کے مدرسین کی طرح بس ایک استاد ہی ہوتا ہے جو یہ بتا دیتا ہے کہ یوں کرو تو اس سے یہ فوائد حاصل ہوں گے اور ایسے نہ کرو تو ان نقصانات سے بچ جاؤ گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ فقر و تصوف میں استاد کا مرتبہ اس سے کہیں اہمیت و وسعت کا حامل ہے۔ پیر استاد صرف بتاتا ہی نہیں ہے بلکہ وہ سب سے پہلے تو اپنی اُن قوتوں کو کام میں

لاتا ہے جو بہت پہلے صوفیانہ نظام تعلیم کے تحت تربیت پانے کے دوران میں خود اُس کے اندر پیدا ہو گئی تھیں۔ مثلاً روحانی توجہ کے ذریعہ تصرف' اجابت دعا' برکت وغیرہ اِن سب کو ملا کر بعض اوقات صرف ایک نام بھی دے دیتے ہیں یعنی قوتِ قدسیہ۔ تو اپنی قوتِ قدسیہ سے پیر ایک طالب حق کو شوق اور جذب عطا کرتا ہے جس سے مرید استقلال اور استقامت کے ساتھ راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اُس کے لیے توفیق کی دعا کرتا ہے جس سے حالات موافق ہو جاتے ہیں اور اُس کے کاموں میں برکت در آتی ہے۔ اِن حالات میں جب مرید اپنے دل کو پاک وصاف کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ کامیاب ہوتا ہے۔

چنانچہ کسی نے کہا کہ پیر کا کام راستہ بتا دینا ہی نہیں ہے بلکہ راستے پر چلا دینا بھی اُسی کے ذمہ ہے۔

اگرچہ پڑھنے سیکھنے کا یہ عمل استاد اور شاگرد دونوں کے باہمی رویہ رضا کے ساتھ آگے بڑھتا ہے لیکن اس کے لیے مشائخ کا مشہور قول ہے کہ مرید کو اپنے تئیں اس طرح مرشد کے حوالے کر دینا چاہیے جس طرح مردہ غسال کے ہاتھ میں ہوتا ہے جبکہ غسال بھی اپنا فرض سمجھتا ہے کہ مردے کو پاک وصاف کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔

پیر اپنے مرید کے تزکیہ کے لیے وہ تمام وسائل بروئے کار لاتا ہے جو اُس کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ وہ بعض ایسے طریقے بھی استعمال کرتا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے غیر محسوس اور عجیب ہوتے ہیں مگر عملاً اُن کا نتیجہ ظاہر و باہر ہوتا ہے۔ اقبال نے فرمایا:

من نمی دانم چہ افسوں می کند
روح را در تن دگر گوں می کند

(میں نہیں جانتا کہ وہ کیا جادو کرتا ہے' بس وہ روح کو جسم میں بدل ڈالتا ہے۔)

مدد

چونکہ مرید کو راستے کے نشیب و فراز اور پیچ وخم سے واقفیت نہیں ہوتی اس لیے وہ بعض معمولی نظر آنے والے کاموں میں بھی پیر کی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے۔ لہٰذا پیر کو چاہیے کہ اُس کی رہبری میں دریغ نہ کرے اور اُس کے لیے دعا بھی کرتا رہے جیسے کسی کے جنازے کو جہاں چاہیں لے جاتے ہیں اور کمال ہمدردی سے اُس کے لیے دعا کرتے ہیں۔

راز کشائی

مرشد فقیری اور درویشی کے نظریہ و اصول کی بھی وضاحت کرے: انسان کیوں پیدا کیا گیا؟ اُس کی ہدایت کا ذریعہ کیا ہے؟ اُسے کیا بننا ہے؟ کس طرح اپنے روحانی ارتقاء کو جاری رکھنا ہے؟

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''روحی'' میں ان سوالوں کا جواب عنایت فرمایا ہے۔ اور جو اس کو سمجھ کر پڑھ لے' اُس کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے کہ وہ مراد پالے گا۔ فرمایا: ''اگر سلسلہ سلوک کا طالب اسے مضبوطی سے پکڑے اور تھام لے' تو صرف اُس کے پکڑ لینے سے میں اُسے زندہ دل اور روشن ضمیر عارف بنا دوں گا۔''

اگر آدمی عقیدہ پکا کر لے تو بے یقینی سے بچ جاتا ہے کیونکہ ''آدم بمیرد از بے یقینی'' (آدمی مرتا ہے تو بے یقینی کی بناء پر) پھر اُسے نہ تو وساوس تنگ کرتے ہیں اور نہ ہی نفس و شیطان اُس کو گمراہ کر سکتے ہیں۔

✿......✿......✿

ت

تصوف

"چونکہ تصوف کے چار حروف ہیں۔ یعنی ت۔ص۔ و۔ ف حرف 'ت' سے مراد یہ ہے کہ راہ مولیٰ میں اپنے آپ کو تصرف کرے۔ اور ارواح محمد ﷺ پر اپنے مال کو تصرف کرے۔ اور حرف 'ص' سے مراد صراطِ مستقیم ہے اور حرف 'وٗ' سے مراد وعدہ خلافی نہ کرنا ہے۔

اور حرف 'ف' سے مراد فتح الغیب اور فنافی النفس ہونا ہے۔ پس جو کوئی ان حروف کے معنی سے واقف نہیں اور اُن کا عامل نہیں' وہ ہرگز تصوف سے آشنا نہیں ہے۔" (محک الفقراء کلاں ص ۵۲)

تصوف کے کسی نمائندہ صوفی میں خواہ وہ کہیں بھی ہو' چار ظاہری و باطنی خصوصیات ضرور نظر آنی چاہئیں۔ ایسا آدمی جہاں کہیں بھی ہو اور کسی بھی شعبہ حیات سے متعلق ہو' دوسروں کی مدد کرنے کا اہل ہوسکتا ہے۔

اپنی ذات اور مال میں تصرف

اپنی ذات میں تصرف کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو وہ اپنی تکمیل ذات کے لیے کسی مرشد کی زیرِ نگرانی عبادت و ریاضت اور صبر و شکر کے ساتھ کوشش میں مصروف ہو اور اگر وہ کسی کو اُس کی باطنی ترقی میں مدد دے سکتا ہو تو دریغ نہ کرے۔ اس طرح وہ مرشد تو نہ ہوگا مگر نیک نیتی سے کسی مرشد کا معاون ضرور ہو سکتا ہے۔ اس تعاون کی ذمہ داری وہ از خود نہیں سنبھال سکتا اس کے لیے اُسے صاحب اجازت ہونا پڑے گا۔ جب اجازت ہوگئی تو پھر اُسے اپنا وقت' اپنی قوت و

ہمت' اپنی استعداد اس کے لیے ضرور صرف کرنی پڑے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب انسان کا دل کھلتا ہے تو اُس کی ظاہری نشانی ایک یہ ہوتی ہے کہ اُس کا ہاتھ بھی کھل جاتا ہے۔ تصوف کے دائرے میں آنے والا بندہ اپنا مال دوسروں پر صرف کرتا ہے۔ بذریعہ صدقہ و قرضۂ حسنہ اور بذریعہ ادائیگی زکوٰۃ و اُمدادی رقوم برائے فلاح معاشرہ وہ مصروف کار نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے کرتا ہے جس سے روح محمد رسول اللہ ﷺ خوش ہوتی ہے۔ اس کام کے لیے کسی مرشد کی ہدایت و اجازت ضروری نہیں۔ یہ بامرِ الٰہی و بحکم رسول اللہ ﷺ اذنِ عام ہے۔

صراطِ مستقیم

شریعت نبوی ﷺ ہی سیدھے راستے کا تعین کرتی ہے۔ جو اس سے ہٹ کر چلتا ہے' اُس کا عمل مردود اور باطل ہے:

پیشوائے خود شریعت ساختم
ہر حقیقت از محمد ﷺ یافتم

ایفائے وعدہ

عام مسلمان کے لیے بھی حکم ہے کہ وہ وعدہ کرے تو پورا کرے۔ مگر یہاں وعدہ سے مراد وہ بیعت ہے جو وہ فقیری کے طریق پر گامزن ہونے کے لیے اپنے مرشد کے ہاتھ پر کرتا ہے۔ وہ اپنے مرشد سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ تصوف میں اُن کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرے گا اور جب تک اُسے اجازت نہیں ملے گی۔ وہ اس غرض کے لیے کسی اور طرف رخ نہیں کرے گا۔

فتح الغیب اور فنائے نفس

ابتداء میں ہی ایک مومن اپنے تئیں شرعی احکام کا پابند کرلیتا ہے مگر طریقت میں اس کا اگلا مرحلہ یہ ہے کہ جو کچھ کرتا ہے' اللہ کی رضا جوئی کے لیے

کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس غرض کے لیے وہ اپنے نفس کو فنا کر دیتا ہے۔ دوسرے لوگ جہنم و سزا کے خوف اور جنت و انعام کے پیشِ نظر اوامر و نواہی کی پابندی کرتے ہیں، مگر درگاہِ تصوف و فقر سے وابستہ صوفی یا فقیر محض اللہ کی خاطر کام کرتا ہے۔ درمیان سے اُس کے نفسی میلانات و رجحانات ختم ہو جاتے ہیں۔

پھر غیب سے اُس کے اندر ایک دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ اُن امور کو دیکھ لیتا ہے جو پہلے علمی طور پر تو وہ جانتا تھا مگر جنہیں دیکھا یا برتا نہ تھا۔ اِن وارداتِ غیبی سے اُس کا ایمان حق الیقین کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔

اس حد تک تو شاید حضرت سلطان العارفین سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں رعایت ہو کہ تصوف پر کماحقہ عمل پیدا ہونا ہر ایک کے لیے ضروری نہیں مگر سلطان صاحبؒ اس کا مطالعہ کرنا یا اس کے بارے میں جاننا ہر ایک کے لیے ضروری خیال فرماتے ہیں کیونکہ جب تک کوئی مسلمان اس کا مطالعہ نہیں کرتا، وہ اپنے متعلق کیسے فیصلہ کرسکتا ہے کہ آیا اُسے تصوف کے دائرے میں داخل ہونا چاہیے یا نہیں۔ اسی لیے آپ نے فرمایا: ''اور اے طالب صادق! جو کوئی علم تصوف کا مطالعہ نہیں کرتا، وہ بدتر از شیطان ہے بلکہ حرص و آز کا بندہ ہے۔ اور ہرگز اُس کا یقین ذاتِ باری پر نہیں ہے۔ چونکہ علم تصوف کے جاننے سے اطمینان رحمانی ہے اور نہ جاننا سراسر کارِ شیطانی ہے۔'' (محک الفقر ص ۵۲)

تفکر

''اب میں تجھ کو شرح تفکر بتلاتا ہوں یعنی تفکر کے چار حرف ہیں: ت ف ک ر

پس 'ت' سے ترکِ ہوا ہے
اور ف سے فنائے نفس ہے
اور ک سے کرامت روح ہے
اور ر سے رازِ حق ہے۔

جس میں یہ حرف نہ ہوں، وہ تفکر سے خالی ہے۔''

(محک الفقر کلاں ص ۱۱۵)

ترکِ ہوا

صحیح تفکر کے لیے ضروری ہے کہ درمیان میں کوئی ہوا و ہوس نہ ہو۔ اگر فکر کے پیچھے کوئی غرض نفسانی یا حرص یا بے صبری ہو تو تفکر کا نتیجہ صحیح نہ ہوگا۔ انسان کی اپنی سائیکی دخل انداز ہو تو تفکر کا رخ بدل جاتا ہے اور اُس سے وہ ثمرات حاصل نہیں ہوتے جو مقصود و مطلوب ہیں۔

تفکر دو طرح کا ہے۔ ایک تو فلسفیانہ تفکر ہے۔ اس کا تعلق دماغ سے ہے۔ دلائل و تجزیہ کے ذریعہ کسی معاملے کو سمجھا جاتا ہے۔ دوسرا صوفیانہ تفکر ہے۔ ''تفکر تصرفِ دل ہے فہم و ادراک اور دلائل و براہین کے میدان میں'' گو تصوف میں تفکر ایک قسم کا مراقبہ بھی ہے مگر اکثر اس میں دلائل عقلی سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

تفکر خواہ کسی قسم کا ہو مگر ہَوا و ہوس درمیان میں آ جائے تو مقصد خطا ہو جاتا ہے۔ پھر بندہ حقیقت کو معروضی طور پر نہیں دیکھ سکے گا۔

فنائے نفس

یہی حال آدمی کی نفسیات کے سلسلے میں کہی جاسکتی ہے۔ تزکیہ دراصل ذاتی نفسیات کا تزکیہ ہوتا ہے۔ انسان کو پیش آمدہ واقعات و حالات اُس کی نفسیات کو تشکیل دیتے ہیں۔ شعوری اور لاشعوری طور پر ہم سب اپنے ماضی سے متاثر رہتے ہیں۔ تفکر میں یہ سب امور رُکاوٹ بن جاتے ہیں۔ تفکر سے پہلے ہمیں اُن سب رکاوٹوں کو دور کرلینا چاہیے۔ جو ہماری نفسیات کی پیداوار ہیں۔ صوفیانہ تفکر میں عام طور پر روحانی نکات موضوع ہوتے ہیں۔ اگر ہماری نفسیات اُس میں دخل انداز ہو تو فلسفیانہ تفکر کے مقابلے میں کہیں زیادہ بربادی ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی

نہ کسی طرح اس کے نتائج کی زد ایمان و اعتقاد پر پڑتی ہے۔

کرامتِ روح

تفکر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نفسیاتی ترفع سے بڑھ کر بندۂ حق روحانی سطح پر پہنچ چکا ہو۔ متقدمین پہلی سطح پر نفس کو دیکھتے تھے۔ دوسری سطح قلب کے لیے تھی اور اس سے بلند تر سطح روح کے لیے مخصوص سمجھتے تھے۔ اس کو اب یوں دیکھا جاسکتا ہے کہ نفسیاتی حاجات حارج نہ ہوں اور ذہن وساوس و خطرات کی آماجگاہ نہ رہے تو پھر روحانی سطح پر فائز بندہ جو کچھ کرتا ہے اور سوچتا ہے' اُس میں کوئی لوث ہی ہوتا ہے نہ خوف۔ روح کی یہی بلند تر سطح تفکر کے لیے موزوں ہوسکتی ہے۔ ایسی صاف ستھری سوچ میں وجدان کی قوت بروئے کار آتی ہے اور کشف' الہام یا القاء کے ذریعے مسائل حل ہوتے ہیں۔

رازِ حق

ہم غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ سب راز ہے۔ فقیروں اور درویشوں کی مجلس میں جب بندۂ حق جاکر کچھ سیکھتا ہے تو اُس پر ان رازوں کی حقیقت کھلنے لگتی ہے۔ جب وجدان اُس کا ذریعہ علم بنتا ہے تو اسے پیغمبروں اور ولیوں کی باتوں پر یقین آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سب کچھ خود دیکھنے لگتا ہے۔

تقویٰ

''تقویٰ کے چار حروف ہیں یعنی ت ق و ی' اب اِن کی تشریح بھی ملاحظہ ہو کہ ہر ایک حرف سے کیا مراد ہے:

یعنی تقویٰ والے کو دو ت چاہئیں۔ ایک ت ترک کی' دوسری توکل کی اور تقویٰ والے کو دو ق چاہئیں۔ ایک ق قہر کا اپنے نفس پر اور دوسرا قادر ہونے کا اپنے نفس پر۔

اور تقویٰ والے کو دو واؤ چاہئیں۔ ایک واحد کی' دوسری وحدت کی اور

تقویٰ والے کو دو ی چاہئیں۔ ایک ی یگانہ بجق' اور دوسری ی یادِ حق کی۔''

(محک الفقر کلاں ص ۴۶)

ترک اور توکل

ترک سے مراد بعض اوقات لوگ یہ سمجھے کہ صوفیاء کرام غیر اسلامی روایات سے متاثر ہوئے اور دنیا و مافیہا کو چھوڑ کر جنگلوں میں تپسیا اور عبادت کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ درحقیقت صوفیاء کی مراد ترک سے یہ ہے کہ روزمرہ کے کاموں میں اسقدر انہماک پیدا نہ کیا جائے کہ دوسرے فرائض پر اس کا اثر پڑے۔ کسی شے یا انسان سے اسقدر محبت نہ کی جائے کہ بنیادی حقائق نظر انداز ہونے لگیں۔ جو کام کیا جائے وہ ذرا ہٹ کر ذہنی و قلبی تحفظ و احتیاط سے کیا جائے جسے انگریزی میں معروضیت **Objective** اور غیر وابستگی **Detachment** کہتے ہیں۔ رہا معاملہ عبادت کا تو مردِ حق جو کچھ کرتا ہے' وہی اُس کی عبادت ہے۔ اس میں ارکان اسلام سے لے کر معاملات اور دینی و دنیاوی تصرفات سب شامل ہیں۔

پھر توکل ہے۔ توکل کے سیدھے سادے معنی تو یہ ہیں کہ اپنی طرف سے کام کرو اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دو۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

''اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر یقین رکھتے ہو۔'' (۵-۴)

''اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے۔ وہ اُس کا گذارہ کر دے گا اور اُس کو روزی دے گا جہاں سے اُس کو خیال نہ ہو' اور جو کوئی بھروسہ کرے اللہ پر' تو وہ اُس کو بس ہے۔ اللہ یقیناً اپنا کام پورا کرلیتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کا اندازہ رکھا ہے۔'' (۶۵-۳)

توکل کے کئی درجے ہیں۔ پہلا درجہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اور بلند تر درجہ یہ ہے کہ جو کچھ پیش آئے' خوش رہے اور اُسے اللہ کی طرف سے سمجھے:
''ہرچہ از دوست آید' خوش است۔'' یا یہ کہ اللہ کی یاد میں اتنا محو ہو کہ جو کچھ پیش آئے' اُسے اُس کی پروا نہ ہو اور اُس کی نظریں ذاتِ الٰہی پر مرکوز رہیں۔

قہر اور قدرت

قہر غلبے یا سزا وسختی کو کہتے ہیں۔ درویش اپنی نفسانی خواہشات کو سختی سے نظر انداز کرتا ہے اور بالآخر اُن پر غلبہ پالیتا ہے۔ صوفی اس ریاضت میں اپنے مرشد سے بھی مدد کے خواہاں رہتے ہیں' وہ مشورے' ہدایت اور اپنی توجہ کے ذریعے ان نفسیاتی موانع پر قابو پالینے میں ان کی مدد کرتا ہے۔ ایک متقی آدمی کا اپنی ذات سے باہر قہر کا عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مثال' توجہ اور باطنی ہمت کے ذریعہ اپنے اردگرد رہنے والوں کو بھی متقی بنا دیتا ہے۔

قدرت یہی ہے کہ ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت ہو' یعنی متقی میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ وہ نیکوکاری کی نیت رکھتا ہے اور عمل پیرا ہونے پر قادر ہوتا ہے۔ وہی جو سلطان صاحب نے فرمایا کہ وہ اپنے نفس پر قادر ہوتا ہے یعنی جو کچھ کرتا ہے' اُس کی نفسیات اُس میں روک نہیں بنتی ہے کیونکہ وہ نفسیاتی احتیاجات سے بلند سطح پر فائز ہوتا ہے۔

واحد اور وحدت

واحد سے ایک تو مراد یہ ہے کہ متقی آدمی خدائے واحد پر ایمان رکھتا ہے۔ اور واحد وہی ہے جو بے مثل اور وراء الوراء ہے...... "یہاں ذات خالص از اسم و رسم و نعت و وصف ہے۔"

بہت نیچے بندہ بھی واحد ہو جاتا ہے جب وہ اپنی اہلیت و استعداد کے مطابق وہ "مقامِ معلوم" پالیتا ہے جو اسی کے لیے خدائے واحد نے مخصوص رکھا ہوتا ہے۔ پھر اس سے کوئی چھوٹا بڑا ہوتا رہے مگر ہو بہو اس جیسا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بقول اقبال انسانی خودی تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ ایک نیم مجذوب "کافر" شاعر کا شعر یاد آرہا ہے:

وحدہٗ لاشریک کے بندے
وحدہٗ لاشریک ہوتے ہیں

وحدت دراصل اصطلاحاتِ تصوف میں وہ مقام ہے جہاں انسان کامل کا ظہور ہوا اور اُس کا نور پھیلا بڑھا بلکہ پوری مخلوقات اُسی نور سے ظاہر ہوئی۔ "اسی کو مقام محمدیہ ﷺ کہتے ہیں اور یہی ہے منشاء روح آنحضرت ﷺ کا۔"

معراج میں اسی مقام کی طرف اشارہ ہوا۔ "قاب قوسین او ادنیٰ" (پھر رہ گیا فرق دو کمان کا میانہ یا اِس سے بھی نزدیک تر۔ قرآن مجید ۵۳-۹)

متقی درویش کو خواہ احدیت اور وحدت کے بارے میں متصوفانہ تشریحات کا تفصیلی علم ہو یا نہ ہو مگر توحید اور رسالت پر اُس کا ایمان مکمل ہونا چاہیے۔ لیکن وہ جو حضرت سلطان صاحبؒ نے رسالت کی بجائے وحدت یا مقام محمدیہ ﷺ کی بات کی ہے قابل غور ہے' رسالت تو شریعت کے اوامر و نواہی تک محدود ہوسکتی ہے مگر ذاتِ محمد ﷺ اور مقام محمد ﷺ کی معرفت جہاں تک استعداد ہو' متقی فقیر پر لازم ہے۔

یگانہ بحق و یادِ حق

یگانہ بحق کا لغوی معنی ہوگا حق کے ساتھ ایک ہو جانے والا بندہ۔ گویا یگانہ بحق وہ عارف ہے جو حق کو پاچکا ہے اور حق کے ساتھ اُس کا تعلق ایسا ہے کہ وہ اُس سے جدا نہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے' حق کا مظہر ہے۔ حق کتنے ہی پردوں میں چھپا ہو' وہ اسے جان لیتا ہے اور وہی کرتا ہے' وہی سوچتا ہے جو حق ہے۔

حق! حق! حق!

ایسا آدمی یادِ حق تعالیٰ سے کب غافل رہ سکتا ہے۔ وہ تو یادِ حق میں اسقدر محو ہوتا ہے کہ لوگوں سے باتیں کر رہا ہوتا ہے یا کسی بھی کام میں مصروف ہوتا ہے مگر دل کی گہرائیوں میں اللہ کا ذکر جاری رکھتا ہے۔ دست درکار دل با یار یا "خلوت در انجمن"۔ "مفتاح العارفین" میں فرمایا: تقویٰ کے چار حرف ہیں۔ ت سے ترک' توکل' تواضع' ترحم اور تلقین۔ ق سے قوی دین' قہر برنفس اور قرب اللہ۔ و سے وعظ پذیر' وحدت فی الوحدت' ی سے یادحق کرنے والا مسلمانوں کی مدد کرنے

والا یا ایسی چیز نہ رکھنے والا جو حق کو پسند نہ ہو۔ (ص ۳۶)

تواضع

تواضع ویسے تو اخلاقِ عالیہ میں ایک بڑا وصف ہے جسے انکساری بھی کہا جاسکتا ہے۔ مگر تواضع میں جو عزت و تعظیم اور احترام و اکرام کے معنی پائے جاتے ہیں۔ وہ صرف انکساری کے لفظ کے استعمال سے ادا نہیں ہوتے۔ بزرگوں، مہمانوں یا بڑوں کی تواضع کی جاتی ہے۔

اگر اللہ کے حضور میں ہو تو پھر تواضع ہے "جناب الٰہی میں بندہ کا پست ہو جانا۔" اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکا دینا تقویٰ کی بڑی اہم خصوصیت ہے۔

ایک اور نفسیاتی اشارہ یہ بھی ہے کہ بعض اوقات ایک متقی شخص کے دل میں اپنے تقویٰ کی وجہ سے ایک پنہاں قسم کا کبر پیدا ہوسکتا ہے۔ جو تواضع اختیار کرے گا، وہ اس سے بچ جائے گا۔

ترحم

یہاں بھی ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔ ایک متقی بندہ احکام الٰہی پر سختی سے کاربند ہو کر شاید اپنے پرائے دوسروں پر حتیٰ کہ جانوروں پر رحم کرنا بھول جائے۔ نیکی کی راہ پر مزاحمت کرنے اور سختی سے کام لیتے ہوئے طبیعت کو سختی کی عادت پڑسکتی ہے۔ ایسے مواقع پر ترحم سے کام لینا چاہیے۔ یہ آمروں اور جابروں کا طریقہ ہے کہ وہ کسی کو پکڑتے ہیں تو سختی سے پکڑتے ہیں۔ اگر شریعت کا کوئی اصول نہ ٹوٹ رہا ہو تو پھر ترحم اور شفقت، نرمی اور ملائمت ہی حسن سلوک کو موثر بنا سکتے ہیں۔

تلقین

تلقین دراصل القاء سے ہے۔ متقی کے لیے اللہ تعالیٰ تلقین کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ تلقین بندۂ حق کے لیے رہنمائی کا ایک بہت زبردست ذریعہ ہے۔ درویش جب مرشد کی خدمت میں پہنچتا ہے تو جہاں مرشد اُسے کچھ باتیں زبانی بتاتا ہے

جیسے ذکر کے طریقے اور اُن کے ثمرات، وہاں وہ اپنی باطنی توجہ کے ذریعے قوت، طاقت اور شوق کی بھی تلقین کرتا ہے۔

طالب حق جب کسی صاحب نظر مرشد کے ہاں جائے اور اُسے محسوس ہو کہ وہ اُس کی مدد کرسکتا ہے تو اُس کے ہاتھ پر بیعت کرلے اور اُس سے تلقین طلب کرے۔ سلطان العارفین رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ چاہیے "تلقین سے چھ ت حاصل ہوں:

اوّل ترک
دوم توکل
سوم توحید
چہارم ترحم
پنجم تواضع
ششم تولاّ بر خدا یعنی خدا سے تعلق (محک الفقر کلاں ص ۲۷۷)

گویا وہ ساری خوبیاں جو تقویٰ کی خصوصیات ہیں اور جو ت کے ساتھ شروع ہو رہی ہیں مرشد اپنی توجہ اور نظر سے اپنے مرید میں پیدا کردیتا ہے۔ فقیر راقم نے کئی بار کہا ہے کہ یہ بات کسی کی سمجھ میں کم ہی آئے گی۔ جب تک مرشد کے حضور میں اُسے خود اِس کا تجربہ نہ ہوگا، اُس کے لیے ماننا مشکل ہے۔

قوی دین اور قرب اللہ

دینی احکام جو پیغمبروں سے ملے جن کی اولیاءؒ اللہ اور علمائے حقؒ نے تشریح فرمائی، متقی ان پر سختی سے کاربند ہوتا ہے۔ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا علم دین ہی عطا کرتا ہے اس لیے جو درویش اور فقیر اِن کو نظر انداز کرتا ہے وہ سلطان صاحبؒ کے نزدیک راندۂ درگاہ ہے۔ سلطان صاحب کے طریقہ کا درویش متقی ہوتا ہے اور پابند شریعت حقہ۔

دین کی اطاعت سے بندۂ حق کو جو قوت عطا ہوتی ہے وہ اسے اللہ کے

قریب لے جاتی ہے۔

باھو! باشریعت یار شو بیدار شو
لائق دیدار شو دلدار شو

(باھو! بیدار ہو جا' شریعت کو ساتھ لے لے' دیدار الٰہی کے قابل ہو کر دلدار بن جا)

وعظ پذیری

تقویٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ متقی درویش کو جو نصیحت کی جاتی ہے' وہ اُسے قبول کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ نصیحت کہاں سے آ رہی ہے یا کون کہہ رہا ہے' اگر وہ اُس کے بھلے کی بات ہے' اُس کے کسی سوال کا جواب ہے' اُس کے کسی مسئلے کے حل کی حامل ہے' یا حکمت کا کوئی نکتہ ہے تو خواہ اُس کا ذریعہ یا واسطہ کوئی بھی ہے' اُس کے لیے نعمت خداداد ہے جسے وہ اپنا لیتا ہے۔

یادِ حق

یادِ حق کی بات پہلے بھی کہی گئی ہے مگر یہاں یادِ حق کا ظاہری ثمرہ ملحوظ رکھ کر بات کی جارہی ہے۔ وہ جو حق کو یاد کرتا ہے۔ حق کے سوا کچھ نہیں کرتا اور حق تعالیٰ کی مخلوقات اور خصوصاً مسلمانوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔ تصوف کے ایک شعبہ فتوت میں تربیت یافتہ درویش تو مدد اور خدمت کے لیے مخصوص کر دیئے جاتے ہیں۔

ث

ثواب

نورالہدیٰ میں فرمایا:

"ہر عذاب بہ نفس و ثواب بروح و ثواب بے حجاب قلب از قران طلب۔" (نورالہدیٰ فارسی ص ۱۰۷)

(ہر عذاب نفس کی طرف سے آتا ہے اور ثواب روح کی طرف سے۔ اور قلب کا ثواب بے حجاب قرآن سے طلب کر)

قرآن مجید اللہ کا وہ کلام ہے جو بے مثل ہے۔ یہ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے قلب اطہر پر نازل ہوا۔ قلب مرکز کو کہتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر ایک مرکز ہے اور اس کا تعلق اُس مرکز سے ہو جاتا ہے جہاں قرآن نازل ہوا تھا۔ اللہ کے نیک بندے جب قرآن پڑھتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن جیسے اللہ کی طرف سے قلب اطہر پر نازل ہوا' اسی طرح اب اُس قلب مبارک سے پڑھنے والے کے قلب میں اُتر رہا ہے۔ یہ وہ ثواب بے حجاب ہے جو قرآن پڑھنے والوں کو ملتا ہے۔

(ثواب کے معنی ہیں اجرت' انعام' بعض اوقات انعام دینے والے کو بھی ثواب کہہ دیتے ہیں)

ج

جمعیت

حضرت سلطان العارفین جمعیت کی اصطلاح جن معنوں میں استعمال کرتے ہیں وہ مطلب کے لحاظ سے صوفیاء متقدمین کی اصطلاح جمع الجمع سے ملتی جلتی ہے۔

''جمع الجمع'' ایک مقام ہے: ''سالک یہاں حق کو خلق سے اور خلق کو حق سے دیکھتا ہے اور حق و خلق کو خلق میں دیکھتا ہے۔ یعنی خلق کو خلق سے اور حق کو حق سے دیکھتا ہے اور ایک کو دوسرے کا 'عین' پاتا ہے۔'' (۵)

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ ''جمعیت'' کو بلند ترین مقام سمجھتے ہیں: ''جب سالک کو علم و فقر و معرفت و توحید و تجرید و تفرید وغیرہ سب حاصل ہو جاتے ہیں تو پھر اُسے ظاہر و باطن میں اور کسی چیز کی احتیاج باقی نہیں رہتی اور مجموع احوالات و مقامات' ذات و صفات اُس کے تصرف میں ہوتے ہیں۔ اسے جواہر جمعیت کہتے ہیں اور جواہر جمعیت کے دو نشان ہیں' ظاہراً شریعت میں ہو اور باطن میں مراقبہ و مشاہدہ مقام ربوبیت و تجلّی انوار میں غرق ہو۔''

(کلید التوحید خورد ص ۴۴)

صاحب جمعیت فقیر کا ظاہر و باطن' جسم و جان' علم و معرفت' ذکر و فکر' وجدان و خرد جب سب ایک ہو جاتے ہیں تو پھر اُس کے لیے ''نور جمعیت'' کلید کل ہو جاتا ہے۔ ''صاحب جمعیت' صاحب مقام فنا فی اللہ' بقاباللہ فقیر کامل ہوتا

ہے۔ اپنے نفس پر قادر ہوتا ہے' روشن ضمیر ہو جاتا ہے اور دونوں جہان اُس کے تابع رہتے ہیں۔ علم تفسیر اُس کی زبان پر ہوتا ہے۔ جمعیت ایک نور ہے جس کی اصل صدق و تصدق اور معرفت و توحید تحقیق و توفیق الٰہی سے ہوتی ہے۔ جمعیت نورِ مقام غیب الغیب ہے جو قلب کے درمیان مبدأ فیاض سے آفتاب کی طرح روشن ہوتا ہے' جب نورِ جمعیت روشن ہوتا ہے تو تماشائے کونین ایک انگشت کے ناخن پر نظر آتا ہے۔'' (ایضاً ص ۱۴-۱۵)

✿.....✿.....✿

ح

حقیقت

''حقیقت کی ح سے حرص کو دُور کرنا''

اصل میں یہاں سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ چار مقامات کا مرحلہ وار ذکر فرما رہے ہیں: ''واضح رہے کہ شریعت طریقت سے متصل ہے اور طریقت حقیقت کے اور حقیقت معرفت سے۔ شریعت کے ش سے شوق' طریقت کے ط سے اطاعت باطنی اور ذکر الٰہی' حقیقت کی ح سے حرص کو دور کرنا اور معرفت کے میم سے محرم اسرار ہونا مراد ہے۔ جس شخص کو یہ چار حرف حاصل ہیں۔ اُسے اہل حرف مجموعہ فقر اور اہل اللہ کہتے ہیں۔'' (جامع الاسرار ص ٦٦)

یہاں یہ نفسیاتی نکتہ غور کرنے کے لیے بیان ہوا ہے کہ جب تک حرص دور نہ ہو حقیقت نظر نہیں آ سکتی اور جب تک کسی شے کی حقیقت نہ کھلے' حرص دور نہیں ہوتی۔ گویا سب سے پہلے جب آدمی درویشی اور فقیری کے حلقے میں آ کر اپنے تعلقات اور معاملات پر غور کرتا ہے تو اُسے نظر آتا ہے کہ اُس کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی نیز اُس کی ترجیحات اشیاء اور واقعات کی اہمیت حقیقت کے مطابق نہیں' اسی طرح بعض چیزوں (جیسے ضرب المثل کے مطابق زر' زن اور زمین) کی حرص میں وہ اندھا ہو رہا ہوتا ہے اور ان کے ساتھ شدید لگاؤ کا انجام اُس کی نظر میں نہیں ہوتا۔ تب وہ کسی استاد سے مشورہ کر کے اس حرص کو دور کرتا ہے اور اُسے

اپنے سے دُور رکھتا ہے یہاں تک کہ حقائق اُس پر کھلنے لگتے ہیں اور جب حقائق کھلتے ہیں تو حرص کے نقصانات واضح ہو جاتے ہیں۔ تب بندۂ حرص سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح اس کا ہر عمل حقیقت پسندی پر مبنی ہوتا ہے۔ سلطان صاحبؒ نے ایک اور موقع پر تنبیہ فرمائی ہے: ''جب تک تو حرص و ہوا کو نہیں چھوڑے گا' تو خدا رسیدہ نہیں ہوگا۔ (اورنگ شاہی ص ۴۸)

خ

خاص الخاص تعلیم

الہامی رسالہ روحی شریف کی تمہید میں فرمایا:

"اس کتاب کا مصنف...... رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو) کی روحِ معنی کے مطابق تفسیر کرتا اور خاص الخاص تعلیم دیتا ہے۔"

خاص الخاص تعلیم سے مراد ہے فقر و درویشی کے پیچھے مابعد الطبیعاتی حقائق کی تعلیم جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ خالق و مالک اللہ ہے۔ اُس نے کائنات اور اُس کے اندر انسان کو ایک مقصد کے تحت پیدا کیا۔ اللہ اُس مقصد کی تکمیل چاہتا ہے اور مقصد برآری کی ساری کارروائی کے درمیان اُس کا نگران ہوتا ہے۔ یہ ساری کارروائی دو قوتوں کے بل بوتے پر آگے بڑھتی ہے۔ عشق (خدا سے اور خدائی سے اور خدائی میں برترین ہستی محمد رسول اللہ ﷺ سے) معرفت (عملی روحانی تجربات اور مشاہدات کے ذریعہ اسرار الٰہی کی پہچان)۔ خاص الخاص تعلیم انہی دو قوتوں کی شرح و تفصیل پر مشتمل ہوتی ہے۔ صوفیاء کی تمام کتب انہی دو موضوعات کی علمی و عملی تشریح کے طور پر لکھی گئیں۔

خموشی

توفیق الہدایت میں نقل فرماتے ہیں:

"اَلْعَافِیَۃُ عَشْراً تِسْعَۃٌ فِی السُّکُوْتِ وَ وَاحِدٌ فِی الْوَحْدَۃِ (عافیت

کے دس حصے ہیں' جن میں سے نو خاموشی میں ہیں اور ایک اکیلے رہنے میں ہے۔" (ص ۹۸)

ایک اور کتاب میں سکوت (خاموشی) کے بارے میں ضرب الامثال کی ایک پوری فہرست نقل فرمائی ہے۔ قدرتی طور پر ہر آدمی اپنی آواز سننا چاہتا ہے اس لیے اپنی معلومات کو دوسروں تک پہنچانے کی خواہش میں لوگ باتونی ہو جاتے ہیں اور انہیں اس خامی کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ درویشی میں یہ خامی سخت نقصان دہ ہے۔ فرمایا:

"پس اے طالب! عارف باللہ کا ہر شخص یعنی شخص غیر سے ہم کلام نہ ہونا آداب خاموشی ہے۔" (محک الفقر کلاں ص ۱۰۸)

عارف صرف اُس وقت بات کرتا ہے جب اُسے حکم ملتا ہے۔ اُس سے کوئی سوال پوچھا جائے تو اذن کے لیے توقف کرتا ہے' اجازت ملتی ہے تو جواب دیتا ہے ورنہ خاموش رہتا ہے۔

"اے درویش! درویش کا راز خاموشی ہے۔ جو حق کے سوا کہتا ہے' وہ عمدہ بات نہیں کرتا اور جو حق ہے وہ عبارت میں نہیں سما سکتا۔"

(مفتاح العارفین ص ۸)

یہاں پھر وہی بات دہرانی چاہیے کہ بات کرنے کا محل زمان' مکان اور اخوان کی موافقت کے مطابق ہوتا ہے۔

حضرت مولانا رومؒ نے خاموشی کی جابجا تعریف فرمائی ہے۔

خمش باش و فنائے بحرِ حق شو

(خاموش رہ! اور بحرِ حق میں فنا ہو جا)

اگر کسی کو مرشدوں کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملا ہو تو یہ بات نوٹ کی ہوگی کہ گو وہاں سوال جواب بھی ہوتے ہیں اور گفتگو بھی رہتی ہے مگر عموماً مجلس کا ماحول خاموشی کی طرف مائل رہتا ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ان کے تذکرہ نگار نے لکھا ہے کہ اگرچہ خاص احباب کو بھی

کبھی بلا کر ''اسرار خاصہ و معارف مکشوفہ'' بیان فرماتے تھے اور آپ کی باتیں ذہن نشین ہو جاتی تھیں لیکن ''اکثر صحبت آنحضرت با اصحاب وغیرایشان بخاموشی بودہ است و اصحاب را از دہشت و ہیبت آنحضرت قدرت آں نبود کہ دم توانندزد۔''(٦)

(دوستوں اور دوسروں کے ساتھ آنحضرت کی صحبت میں اکثر خاموشی رہتی تھی۔ اور دوستوں کو آنحضرت کی دہشت و ہیبت کی وجہ سے اس قدر قدرت نہ تھی کہ دم مار سکیں)

چہ قبلہ کردہ ای ایں گفت و گو
طلب کن درس خاموشاں کجا است

(رومیؒ)

(تو نے کیا اس گفتگو کو ہی مطلوب سمجھ لیا ہے؟ خاموش فقیروں کے درس ڈھونڈ کہ وہ کہاں اور کیسے ہیں؟)

خواب

خواب' مراقبہ اور کشف و الہام درویشوں کے لیے ہدایات کے ذرائع ہیں جو فقیری اور درویشی میں غیب سے ملتی رہتی ہیں۔

خواب سب سے زیادہ عام اور وہبی ذریعہ ہے مگر دوسرے تمام وجدانی مشاہدات کی طرح اس کے ذریعہ دی جانے والی ہدایات کی زبان تصویری اور علامتی ہوتی ہے حضرت سلطان العارفینؒ نے درویشوں کو اکثر تعبیرات سے بھی آگاہ فرمایا ہے:

''اگر کوئی شخص ہر روز خواب میں فقیروں سے ملاقات کرے یا ذکر الٰہی میں مشغول ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ اُس کا رُخ توحید کی جانب ہے اور وہ دیدار مولا کا طالب ہے اور یہ کہ اُس کا کام دن بدن ترقی پر ہے۔

اگر کوئی شخص خواب یا مراقبے میں کافروں یا اہل زنار کی مجلس دیکھے تو جاننا چاہیے کہ اُسے مقام نفی لا الہ تو حاصل ہے لیکن ابھی مقام اثبات الا اللہ

کو نہیں پہنچا......

اگر کوئی شخص خواب یا مراقبے میں ہر روز کسی سے جنگ کرے اور اپنے تئیں اُس میں باعظمت و ہیبت دیکھے تو گویا وہ اپنے نفس سے جنگ کر رہا ہے اور اُس کا مرتبہ باطن میں نمازی کا سا ہے......

اگر کوئی شخص ہر رات خواب میں حیوانات دیکھے تو سمجھ لو کہ اُس کا دل خطرات کے سبب سیاہ ہے اور وہ دنیا کا طالب اور گمراہ ہے......

اگر کوئی شخص خواب یا مراقبے میں قرآن کی تلاوت کرے یا نماز پڑھے یا اذان دے یا باغ وغیرہ دیکھے تو اُسے اولیاء و علماء کی صحبت اور مجلس نصیب ہوگی اور اُس کا خاتمہ بالخیر ہوگا اور دنیا سے باایمان جائے گا......

اگر کوئی شخص خواب یا مراقبے میں اپنے تئیں گھوڑے پر سوار دیکھے یا کشتی پر سوار ہو کر دریا عبور کرے تو اُس کا مطلب جلدی حاصل ہوگا۔

جو شخص روشن ضمیر اور منتہی فقیر ہے۔ اُسے خواب یا مراقبہ یا استخارہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ عین آنکھوں سے ہر بات کا مشاہدہ کر لیتا ہے' سارا جہان اُس کے سامنے رہتا ہے اور وہ دوست سے ملا رہتا ہے۔''

(نورالہدیٰ خورد ص ٣٤-٣٥)

مراقبہ اور خواب کی کیفیت میں اگرچہ فرق ہے مگر دونوں کی رمزیہ زبان ایک سی ہوتی ہے اسی لیے سلطان العارفینؒ تعبیر کے سلسلے میں دونوں کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہیں:

''بعض لوگ جو مراقبہ میں ندی کا پانی' باغ' حور و قصور دیکھتے ہیں یا خواب میں نماز پڑھتے ہیں' مدینہ منورہ کے حرم کی زیارت کرتے ہیں۔ یہ اہل تقویٰ اور اہل جنت اور علمائے باعمل کا مرتبہ ہے یا خواب اور مراقبہ میں دریا کے پانی میں کھیلتے ہیں اور پھر یہ چھوڑ کر سیر و طیر کرتے ہیں۔ اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول ہوتے ہیں اور مجلس محمدی ﷺ میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں اور نور توحید و معرفت کے دریا میں غوطہ لگاتے ہیں۔ یہ مراتب فقیر کامل اور عارف باللہ کے ہوتے ہیں پس

معلوم ہوا کہ خواب کا مرتبہ تعبیر ہے اور مراقبہ کا مرتبہ روشن ضمیر ہے لیکن عارفوں کو نہ مراقبہ کی ضرورت ہے نہ خواب کی۔ کیونکہ اُنہیں اللہ تعالیٰ سے ایک دم میں ہزارہا الہام ہوتے ہیں اور جناب سرورِ کائنات ﷺ سے پیغام سنتے ہیں اور قربِ حضوری کے سبب جواب یا صواب پاتے ہیں......" (کلید التوحید کلاں ص ۳۰۴)

خودی

"خ سے وجود میں خوئے خودی زائل ہو جاتی ہے۔" (محک الفقر خورد)

یہاں خودی ان معنوں میں نہیں جسے بعض حکماء سمجھتے ہیں یا جس طرح ہمارے ہاں علامہ اقبالؒ نے اس کے معنی سمجھائے۔ بلکہ یہ خودی منفی قدر ہے جسے معلمین اخلاق نفس امارہ کے مفہوم میں بیان کرتے ہیں۔ خودی سے مراد ہے خود پسندی، خودغرضی اور خود مرکزیت یا نرگسیت وغیرہ۔ جب تک یہ خودی دور نہ ہو، بندہ فقیری سے تو کیا عام آدمیت سے بھی دور رہتا ہے۔

د

"واضح رہے کہ ظاہری و باطنی علوم، معرفت، توحید، تصوف اور سلوک وغیرہ کی بنیاد فقط ایک حرف "دال" پر ہے...... واضح رہے کہ حرف دال کا علم لازوال اور معرفت الٰہی، توحید، قرب اور وصال پر دلالت کرنے والا ہے کیونکہ اس سے نور ذات کا مشاہدہ اور احوال کی تجلیات نصیب ہوتی ہیں اور نص اور حدیث کے مطابق حال ہوتا ہے۔ علم کے معنی ہیں جاننا۔ لیکن جاننا کس بات کا؟ وہ چیز جس پر دال دلالت کرتا ہے۔ دال کون سی چیز ہے اور کس علم پر دلالت کرتا ہے؟ دال نہی منکر پر دلالت کرتا ہے نیز امر معروف پر، نیز آیاتِ قصص الانبیاء پر اور آیاتِ ناسخ اور منسوخ پر دلالت کرتا ہے اور دال حدیث نبوی ﷺ و قدسی پر دلالت کرتا ہے۔

مقام راز و رحمت اللہ میں پہنچاتا ہے......

"علم کے معنی پانچ دال کا جاننا ہے۔ جو شخص اِن پانچ "دال" کا علم نہیں جانتا۔ اُس کے لیے علم پڑھنا وبال ہے۔ ایسا شخص ظاہری عالم اور باطنی جاہل ہوتا ہے۔ پانچ دال کا علم یہ ہے: اوّل علم دعاء الخیر، دعا قبولیت بدرگاہ الٰہ، دوسرے رفع شیطان کا علم، تیسرے زندہ دل اور معرفت دیکھنے والا، چوتھے علم دنیائے دون کو تین طلاق دیتا ہے...... پانچویں علم دوامِ غرق فی التوحید اور غالب بر نفس۔"

(توفیق الہدایت ص ۸۸)

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں متعلم اور معلم یعنی طالب علم اور عالم دین دونوں کے لیے یہ پانچ شرائط لازمی خیال کی ہیں۔ جب وہ علم کا مطالعہ کریں تو اِن کا لحاظ رکھیں ورنہ یہی علم اِن کے لیے "وبال" ہو جائے گا۔ یہ بات تو ہر ایک مانتا ہے کہ علم تو ایک تلوار ہے جہاں اور جس طرح چلاؤ گے، چل جائے گی یا ایک گھوڑا ہے، جس طرف لے جاؤ گے، چلا جائے گا۔ اس خاطر علم پڑھنے کے لیے بھی کچھ قواعد کی پاسداری ضروری ہے۔ سلطان العارفینؒ انہی کا ذکر فرما رہے ہیں:

دعاء الخیر

علم پڑھتے ہوئے طالب علم اور عالم دونوں یہ دعا کیا کریں کہ اس علم سے انہیں نفع اور ترقی حاصل ہو، وہ پیچھے نہ جا پڑیں۔ یہ علم انہیں وساوس، اوہام اور خطرات کی طرف نہ لے جائے بلکہ ایمان اور یقین کی طرف رہنمائی کرے۔ کوئی سا بھی علم ہو، دونوں امکانات موجود رہتے ہیں۔ اس لیے دعاء الخیر ضروری ہے۔ جہاں یہ فرمایا گیا کہ کہو رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (اے رب، میرا علم زیادہ کر) وہاں یہ بھی تنبیہ کی گئی کہ دعا کرو اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا (یا اللہ میں تجھ سے نفع بخش علم کا سوال کرتا ہوں)۔

یہ دعا کرتے ہوئے دعا کنندہ اُن تمام وسائل کو کام میں لائے جو دعا کی

قبولیت کے لیے ضروری ہیں: بزرگوں سے دعا کی درخواست، ادب اور تواضع، خشوع وخضوع اور اخلاص وغیرہ۔

دفع شیطان کا علم

جب شیطانی قوتیں حصول علم کے دوران دخل انداز ہوں تو علم والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کا تدارک کیسے کیا جاسکتا ہے۔ شیطان کی دخل اندازی کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں جیسے خود اپنی کاہلی و سستی، ظاہری مشکل حالات، بے قاعدگی اور تذبذب وغیرہ اب طالب علموں اور عالموں کو ان حالات میں دفعیہ کے لیے کیا کرنا چاہیے، اِس کے لیے بھی کئی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں: پابندیٔ شرع، نماز اور دعا، کسی حکیم صفت مرشد سے مشورہ اور مزاحمت و استقامت وغیرہ۔

زندہ دل اور اہل معرفت

ہر بار جب طالب علم یا عالم اپنی نیت خالص کرلیتا ہے تو اس کے دل کو نئی زندگی ملتی ہے یا اگر کوئی من چلا کسی مرشد کے ہاں جا کر اعتقاد مضبوط کرلیتا ہے تو زندہ دل ہو جاتا ہے۔ رسالہ روحی میں ارشاد فرمایا کہ "اگر سلسلہ سلوک کا طالب اسے (رسالہ روحی کو) مضبوطی سے پکڑلے اور تھام لے (اس کے مندرجات کو ذہن نشین کرے) تو صرف اس کے پکڑ لینے سے میں اُسے زندہ دل و روشن ضمیر عارف بنا دوں گا۔"

معرفت سے یہاں مراد یہ ہے کہ اگر طالب علم یا عالم جو کچھ پڑھیں، اسے اپنے تجربے میں لاتے چلے جائیں تو صاحب معرفت ہوتے چلے جائیں گے یعنی مطالعہ ان کے علم کا حصہ بنتا چلا جائے گا تو اس سے آگے بڑھنے میں مدد ملے گی۔ معرفت علمی و روحانی تجربات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انہی سے حقائق کھلتے ہیں اور پہچان (معرفت) بڑھتی ہے۔

علم دنیائے دون سے دوری

علم دنیائے دون کیا ہے؟ ہر وہ علم جو محض دولت اور اقتدار یا مال و منصب اور جاہ وحشم کے حصول کے لیے حاصل کیا جارہا ہو، علم دنیا ہے۔ خواہ وہ علم دین ہی کیوں نہ ہو اور ہر وہ علم جو خیر طلبی، خدمت خلق اور قوم و ملت کی معاونت کے پیش نظر حاصل کیا جارہا ہو، وہ علم نافع ہے خواہ براہ راست اُس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو جیسے انجینئرنگ، میڈیسن، کیمسٹری، ریاضی اور منطق وفلسفہ وغیرہ۔

قطاری مشائخ" کے ہاں ایک دعائے سعادت ہے۔ اُس میں یوں کہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ "اے اللہ، ہمیں لوگوں میں مغرور مت بنا، خدمت سے محروم نہ رکھ، نعمت ہم سے نہ چھننے پائے اور ہمیں ان کے ساتھ مت کر جو دین کو بیچ کر دنیا کماتے اور کھاتے ہیں۔"

جب مسلمانوں کی حکومت تھی تو لوگ بعض اوقات دین کا علم اس لیے حاصل کرتے تھے کہ قاضی اور منصف بن کر مالدار اور صاحب منصب بنیں، یوں ہو تو علم دین بھی علم برائے دنیائے دون بن جاتا ہے۔

علم دوام غرق فی التوحید اور غالب بر نفس

طالب علم اور عالم دونوں کو ایمان کی پہلی سیڑھی (توحید) سے ہرگز نہیں اُترنا چاہیے۔ اگر توحید نہ رہی تو کچھ بھی نہ رہے گا اور کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ ہر وقت خدائے واحد کو حاضر، ناظر جان کر علم کے لیے کوشاں رہنا چاہیے اور نفس پر غالب ہونے کے لیے بھی یہی اصول ہے کہ خدائے واحد کے احکام کی سختی سے پابندی اور تعمیل کرنی چاہیے یہاں تک کہ کوئی نفسیاتی روکاوٹ یعنی تذبذب، حرص، بدگمانی اور الجھن سر راہ نہ بنے۔

اگر یہ پانچ شرائط علمی حلقوں میں موجود ہیں تو یہ ان کے حصولِ علم پر دال ہیں ورنہ جو کچھ سیکھا جائے گا، خیر کی بجائے شر کی جانب لے جائے گا۔ تعمیر نہ ہوگی،

تخریب ہوگی' ترقی نہ ہوگی' رجعت ہوگی۔

دعوت

حضرت سلطان العارفین سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے روحانی تربیتی نصاب میں تصورِ اسم ذات اور دعوت القبور کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ راقم نے دعوت کے بارے میں اپنی کتاب ''احوال و مقامات حضرت سلطان باھوؒ'' میں اس کی جو شرح بیان کی۔ اُس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو تاکہ دعوت کے بارے میں کچھ ابتدائی معلومات ذہن نشین ہو جائیں:

''دعوت کے لیے دو چیزیں لازمی ہیں' قبر اور قرآن یعنی کسی ولی کی قبر ہو اور اُس پر قرآن پڑھا جائے۔ اس کے جو آداب حضرت سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کئے' وہ یہ ہیں:

۱- (الف) پڑھنے والا ولی اللہ ہو' اسم اللہ ذات کے تصور کا عامل ہو یا صاحب توجہ خاص ہو۔ اگر اور کچھ نہیں تو طالب صادق ہو۔ جس قدر بلند مرتبہ ہوگا' اُسی قدر اُس کی دعوت کا اثر زیادہ اور اُس کا دائرہ تسخیر وسیع ہوگا۔

(ب) ناقص کو یا طالب خام کو دعوت پڑھنے کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔ 'اگر طالب قبر پر آنے سے خوف کرے' تو جاننا چاہیے کہ وہ طالب صادق نہیں ہے۔ اُسے اپنی جان سے محبت ہے' یا ''جو شخص دنیا یا کسی دنیادار کے لیے دعوت پڑھتا ہے' ناقص ہے۔' اگر ناقص دعوت پڑھے گا تو رجعت میں پڑ کر دیوانہ و مجنون ہو کر خراب و خستہ حال ہوگا۔

۲- دعوت پڑھنے کے لیے مرشد کی اجازت بہتر ہے کہ اُس کی توجہ شامل حال رہے گی۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ اجازت کے بغیر 'دعوت' پڑھنے والا

محروم رہے۔

۳- رات کے وقت کسی غالب الاولیاء بزرگ کی قبر پر حاضر ہو کر اُس کی پائنتی یا اس کے سرہانے بیٹھ کر یا گھوڑے کی طرح قبر پر سوار ہو کر جس قدر ہو سکے' قرآن مجید تلاوت کرے۔ (دعوت پڑھتے ہوئے قبر پر سوار ہونے کو سلطان صاحب رحمۃ اللہ علیہ برا نہیں سمجھتے' البتہ ناقص یا خام کو اُس کے نتائج سے ضرور خبردار کر دیتے ہیں)۔

۴- نوری یا باطنی قوت یعنی توجہ' تصرف' تفکر وغیرہ کے ساتھ حاضر الوقت ہو کر قرآن مجید پڑھے۔

۵- اگر عامل کامل ہے تو منہ کی زبان سے دعوت نہ پڑھے کیونکہ زبان نیک و بد گفتگو سے عموماً آلودہ رہتی ہے۔اس لیے قرآن پڑھنے کے لائق نہیں' بلکہ دل کی زبان سے پڑھے اور صاحب دل سنے یا سر کی زبان سے پڑھے اور صاحب سرّ' قلب اُسے سنے'

۶- عامل کامل کو صرف ان امور کے لیے دعوت پڑھنی چاہیے:

(الف) بادشاہ اسلام کے لیے جو کافروں سے جنگ کر رہا ہو۔

(ب) رافضیوں اور خارجیوں کے لیے کہ اللہ انہیں ہدایت دے۔

(ج) علماء منافق کے لیے جو امر معروف کو قبول نہیں کرتے۔

(د) آبادی و جمعیت خلق اور باران کے لیے۔

(ر) اُس شخص کی مدد کے لیے جو دعوت پڑھتے وقت رجعت میں آ کر دیوانہ ہو گیا ہو۔

س۔ کسی عالم باعمل کی مدد کے لیے جسے کوئی مہم پیش آئی ہو۔ مذکورہ

تفصیل سے ظاہر ہے کہ دعوت' توجہ' تصرف اور تصور کا عمل ہے۔ اسے پڑھتے وقت صرف کسی اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ (۷)

اب دعوت کے اسرارالحروف کی طرف آیئے۔ سلطان باھوؒ فرماتے ہیں:

"واضح رہے کہ علم تکبیر دعوت ہے۔ دعوت کے چار حرف ہیں۔ ان میں بزرگی' عزت اور شرف ہے۔ اِن چار حرفوں کی شرطیں یہ ہیں:

حرف د سے دل پاک ہوتا ہے اور ہمیشہ ذکر میں مشغول رہتا ہے اور حضور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دائمی ذکر حاصل ہوتا ہے۔

حرف ع سے علم غیبی مفصل حاصل ہوتا ہے۔ روحانی الہام ہوتا ہے اور عالم غیب میں سے ہر ایک مؤکل کا علم ہوتا ہے۔

حرف و سے ورد و وظائف اور کلام اللہ کو بالترتیب باادب باعزت اور بااعتقاد پڑھا جاتا ہے۔

حرف ت سے تارک (یعنی نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام نے جن چیزوں کو ترک کیا' انہیں ترک کرے) تب اسے ان کی زیارت نصیب ہوگی۔

اِس قسم کی دعوت مبتدی کا کام ہے۔" (فکر جنت ص ۱۲)

(کلیدالتوحید کلاں ص ۳۳۵ وشمس العارفین)

حلقہ فقر میں آنے والا ہر درویش یہ دعوت پڑھ سکتا ہے کسی بھی فارغ وقت میں' ہوسکے تو رات کے کسی پہر میں کسی ولی کبیر کی قبر پر جائے اور قبر کے سامنے جہاں سینہ ہوتا ہے' بیٹھ کر قرآن مجید کی کوئی سورت پڑھے یا اپنے اوراد و وظائف میں سے کوئی بھی کلام پڑھے۔ اس کے لیے شرائط بھی نسبتاً آسان ہیں۔

پاک دل اور ذاکر

مرشد کی نگرانی میں اہل دعوت درویش اپنا تزکیہ کرچکا ہو۔ اُس کا دل ہوا وہوس یا بری خواہشات سے پاک ہو' نیز ہمیشہ ذکر میں مشغول رہتا ہو۔ یعنی مرشد نے جو اذکار تلقین کئے ہوں ان پر کاربند ہو۔

علم غیبی' الہام اور مؤکلین کا علم

یہاں دعوت کا نتیجہ یا نفع درمیان میں بیان فرما دیا ہے۔ بہت سی نہاں قوتیں اہل دعوت درویش پر منکشف ہوتی ہیں۔ ہر وہ علم غیب ہے جو ہم سے پوشیدہ ہے۔ الہام "بہت سی باتیں کھلتی ہیں اور ان قوتوں (مؤکلین) کا بھی علم ہوتا ہے جو اُس کی چارہ سازی کرتی ہیں۔ یہ مؤکلین جو از قبیل فرشتہ ہوتے ہیں' کسی بھی شکل میں آ کر امداد کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ احتیاط لازم ہے کہ اِن کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔ ورنہ یہی قوتیں جو تھوڑی دیر پہلے مددگار تھیں' چھلاوا بن جائیں گی اور پیچھے بھاگنے سے ہاتھ نہ آئیں گی۔ بس طالب حق اہل دعوت اس علم پر قانع رہے کہ غیبی قوتیں اُس کی مؤید ہیں اور اُس کے لیے کام سرانجام دے رہی ہیں۔

اوراد و وظائف اور کلام اللہ

قبر کے سامنے بیٹھ کر درویش چاہے تو اپنے اوراد و وظائف میں سے کچھ پڑھے یا قرآن مجید کی کوئی سورت (عموماً سورۂ یٰسین اور سورۂ ملک یا سورۂ مزمل پڑھنے کو کہا گیا ہے) پڑھے۔ مگر جو کچھ پڑھے ادب اور عزت اور یقین کے ساتھ۔ اعتقاد کی شرائط کو ملحوظ رکھے۔

ترک و زیارت

شریعت نبوی ﷺ کی نواہی سے بچنے اور اس طرح پڑھنے سے وجدان کا ملکہ بروئے کار آئے گا۔ اور وہ ہستیاں جو اُس کے سامنے معیار کامل رکھتی ہیں یعنی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے ساتھی۔ ان کی زیارت نصیب ہوگی۔ نیز ان مشائخ سے بھی روحانی طور پر ملاقات ہوگی جو ولایت کبریٰ کے مقامات پر فائز تھے۔ شرط وہی ترک ہے' جن چیزوں کو انہوں نے ترک کیا۔ وہ بھی اُن کا تارک ہو۔

منتہی یعنی فقیر کامل اہل دعوت میں کوائف روحانی یہ ہونے چاہئیں:

دعوت کے چار حروف ہیں۔ د' ع' و' ت

حرف د سے دوام صاحب مشاہدہ حضور ہو۔

حرف ع سے عیاں بین' عیاں بخش' عالم عین العلم ہو۔

حرف و سے واردات غیبی اور الہام و جواب باصواب ہر آیات سے دکھانے والا ہو۔

حرف ت سے صاحب توجہ' صاحب تصور' صاحب تصرف' صاحب تفکر' صاحب تہاون صاحب تمثل' صاحب ترک' صاحب توکل' صاحب توحید' صاحب تجرید' صاحب محاسبہ وتفحص نفس اور صاحب توفیق ہوکر ان جملہ مراتب کی ت توفیق کوعمل میں لاتا ہو اور ہر دعوت سے پھل کھاتا ہو۔ (نورالہدیٰ ص ۹۴ ترجمہ فقیر نور محمدؒ)

سلطان العارفینؒ نے دعوت پڑھنے والے کی جو صفات لکھی ہیں۔ دراصل وہ سب فقیر کامل کی صفات ہیں۔ فقیر کامل ہی صحیح معنوں میں دعوت پڑھنے کا اہل ہے۔ نچلے درجوں پر درویشوں اور فقیروں کی دعوت خوانی کی قبولیت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

دوام صاحب مشاہدہ حضور

صاحب دعوت کو ذکر وفکر کا وہ مرتبہ حاصل ہو جسے حضوری کہتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' چلتے پھرتے وہ اپنے تیئں اللہ کے حضور میں حاضر جانتا ہو۔ جب چاہے' روحانی طور پر نیند یا بیداری میں حقائق کا مشاہدہ کرسکتا ہو۔ اس کے لیے یہ صلاحیت ہنگامی نہ ہو' بلکہ وہ جب چاہے' تقدیر کی کارکردگی دیکھ سکتا ہو۔

عیاں بین' عیاں بخش' عالم عین العلم

دعوت کا پڑھنے والا عالم عین العلم ہونا چاہیے۔ یہاں علم سے مراد وہ علم الٰہی ہے جو کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے بارے میں اللہ کے ہاں موجود تھا اور آئندہ بھی موجود رہے گا۔ اسے ہم علم الٰہی کی ایسی حقیقت کہیں گے جو علم الٰہی

میں تو موجود ہے مگر باہر کہیں نہیں۔ متقدمین صوفیاء و فلاسفہ اسے ''عین ثابت'' کہتے ہیں۔ حکماء نے جب کائنات کی مختلف اشیاء پر نظر ڈالی تو علم الٰہی میں ہر ایک شے کی حقیقت کو الگ الگ بھی دیکھا انہیں وہ ''اعیان ثابتہ'' کہتے تھے۔ گویا اس حکمت کی رو سے ہر شے اور ہر شخص کے لیے الگ ''عین'' علم الٰہی میں موجود ہے۔ یہ دراصل ہر شے کے بنیادی نقش یا حقائق ہیں جن کو ہم اُن کا جوہر اصلی بمعنی صلاحیت و استعداد کہہ سکتے ہیں۔ اب عالم عین العلم وہ عارف فقیر ہوگا جو علم الٰہی کے مصدر تک نگاہ رکھتا ہو یا جو لوحِ محفوظ کو پڑھ سکتا ہو۔ اور جو شے یا شخص سامنے آئے' اس کے عین ثابتہ یعنی اس کی اصلیت اور مقصد پیدائش کو وہ بالیقین دیکھ سکے اور اس کے نصیب کے مطابق اس کی مدد کرسکے۔

پھر وہ ''عیاں بین'' اور ''عیاں بخش'' ہو۔ اس کی نظر بصیرت پر سب کچھ ظاہر ہو۔ وہ کارخانہ قدرت کے ڈیزائن اور نمونے کو سمجھ سکتا ہو جیسے وہ چل رہا ہے۔ تقدیر کے تانے بانے کا خیر وشر اس کے سامنے ظاہر ہو۔ وہ عین بیداری میں پنہاں کو عیاں دیکھنے کا اہل ہو اور اس سے بڑھ کر ''عیاں بخش'' ہو یعنی اپنے پاس آنے والے طالبانِ حق کو بھی یہ اہلیت بخش سکے تاکہ وہ بھی اس ''کارگہ شیشہ گری'' کے پیچھے حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھ سکیں۔

واردات از ہریک آیات الہام نمائے جواب باصواب

ہر اِک آیات سے واردات غیبی اور الہام کے ذریعہ جواب باصواب عطا کرنے والا ہو بلکہ دکھا دینے والا ہو۔ ایسا ولی اللہ دعوت القبور پڑھنے کا اہل ہے۔ جس کی نظر میں کائنات کی ہر شے ایک آیت (نشانی) ہے۔ ان نشانیوں کو وہ اس طرح فعال اور متحرک کردے کہ اُس کے پاس آنے والے ارادت مند درویش روحانی تجربات و مشاہدات سے مشرف ہوں اور جس طرف نظر کریں' ان آیات سے کشف و الہام کے ذریعہ جواب باصواب پاتے چلے جائیں۔

صوفیاء کرامؒ ولایت کے اس رتبے پر فائز بزرگ کو قطب وحدت کہتے

ہیں اور حضرت سلطان العارفینؒ اکثر اسے مالک الملکی فقیر بتاتے ہیں۔ قطب وحدت کی شخصیت اس قدر موثر ہوتی ہے کہ اگر کوئی اُس کی صحبت و مجلس میں بیٹھنے والوں کے پاس بھی رُکے تو اُس کی بھی باطنی قوتیں جاگ اُٹھتی ہیں اور خواہ وقتی طور پر سہی مگر روحانی سرحدوں تک وہ پہنچ جاتا ہے جہاں وہ الہام والقاء کے ذریعہ اپنے سوالوں کے جواب پالیتا ہے۔ یہی توجہ اُسی فقیر کامل کی ہوتی ہے جو قطب وحدت ہوتا ہے اور ایک عالم میں اُس کی توجہ جاری و ساری ہوتی ہے۔

صاحب توجہ، صاحب تصور، صاحب تصرف

وہ عارفوں کا سلطان اور مردانِ خدا کا بادشاہ ہے۔ نائب حق اور نائب رسول ﷺ ہے۔ اُس کی توجہ اور تصور اور تصرف سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ قلوب و ارواح میں انقلاب آ جاتا ہے۔

من نمی دانم چہ افسوں می کند
روح را درتن دگر گوں می کند

(مجھے معلوم نہیں وہ کیا افسوں کرتا ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ جسم کے اندر روح کو بدل ڈالتا ہے) اس کی فکر اکنافِ عالم میں پھیل جاتی ہے کہ وقت کا تقاضا یہی ہوتا ہے اور سعید روحیں اسے قبول کر لیتی ہیں۔ وہ بظاہر بے سروسامان ہوتا ہے مگر اس کا توکل رضائے الٰہی کو ہمراہ لے لیتا ہے۔ دنیا کی اُس کو حاجت نہیں ہوتی کیونکہ ہر شے اُس کے اشارے پر حاضر ہوسکتی ہے مگر چونکہ وہ مشیت و تقدیرِ الٰہی کو جانتا اور سمجھتا ہے وہ حکم الٰہی کے بغیر کسی مطلوب کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ سب سے الگ کھڑا ہوتا ہے مگر نقش حیات و نقش قدرت کو جانتا ہے اور توفیق رکھتا ہے کہ ان کی نقش بندی کرے مگر پھر وہی بات کہ وہ تو لوحِ محفوظ پر نظر رکھتا ہے اور اُس کے مطالعہ کی روشنی میں ہی عمل پیرا ہوتا ہے۔

دعوت پڑھنے والے کے یہ سارے اوصاف بیان کرتے ہوئے خود حضرت سلطان صاحب کا فیصلہ یہ ہے کہ جو آدمی (فقیر کامل) اس مرتبے پر فائز ہو

اور ان قوتوں کا مالک ہو، وہ تو محض توجہ سے ہی اپنا کام کرسکتا ہے۔ ''فقیر کامل کہ صاحب قرب اللہ پروردگار، آں را دعوت چہ درکار'' (فقیر کامل جو اللہ پروردگار کا قرب رکھتا ہے، اسے دعوت سے کیا کام؟) ''بلکہ دن رات چلوں اور خلوت میں بے حد دعوتیں پڑھنے اور لڑائی کے لیے پیادہ اور سوار لکھوکھا فوج جمع کرنے اور کروڑوں روپے خرچ کرنے سے فقیر کامل کی ایک بار توجہ بہتر ہے۔''

(نورالہدیٰ ص ۹۴)

کون یقین کرے گا کہ ایسا مقتدر شخص ہر زمانے میں موجود ہوتا ہے، چونکہ دنیادار اُسے نہیں دیکھ سکتے اسی لیے سلطان صاحب نے دُنیا کو تو آدمی لعنت کا مستحق سمجھا مگر دنیاداروں پر پوری لعنت بھیجی۔

اَدھی لعنت دنیا تائیں تے ساری دنیا داراں ہو۔

جب تک کوئی دیکھے گا نہیں، کیسے یقین کرے گا۔ مگر دیکھنے والی آنکھیں کہاں سے لائے؟...... اسی لیے مولانا رومؒ نے فرمایا تھا:

اگر شرح خواہی، بہیں شمس تبریز
چوں او را بدیدی، او را بدانی

(اگرچہ کچھ زیادہ جاننا چاہتے ہو تو بس شمس تبریز کو آ کر دیکھ لو، جب اُس کو دیکھ لو گے تو خود ہی جان لو گے!)

نورالہدیٰ میں دعوت کے باب میں آخری سطور میں فرمایا: اہل دعوت فقیر کامل ''عرش کے فرش پر کرسی پہ بیٹھا لوح محفوظ کا مطالعہ کرے۔ اوّل تو یہ دعوت وہی پڑھے جو پڑھتے ہوئے ہر آفت و رجعت و بلا اور اٹھارہ ہزار عالم جن و انس اور مخلوقات کی دشمنی سے اپنے تئیں بچائے رکھے۔ یہ ہے ق سے قرب۔ ق سے قبر، ق سے قرآن، ق سے قوت، ق س قدرت ق سے قہر، ق سے قوی...... اس دعوت سے سخت تر کوئی نہیں۔'' (نورالہدیٰ ص ۱۱۰)

یہ سب شرائط دعوت ہیں یعنی اہل دعوت قربِ الٰہی کے اعلیٰ درجہ پر فائز

ہو' کسی غالب الاولیاء کی قبر پر اپنی قوت قدسیہ کی مدد سے قرآن پڑھے' اپنے نفس پر قادر اور غالب ہو اور روحانیت میں قوی ترین ہو۔

درویش

"درویش میں لفظ درویش کے پانچ حروف کے مطابق پانچ اوصاف ہونے چاہئیں:

د سے درد

ر سے راست دینی

و سے واحدانیت' وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ

ی سے یادِ حق

ش سے خدا اور رسول ﷺ کے نافرمودہ سے شرم کرنا

جو درویش اِن صفات سے متصف ہے' وہ مستغنی اور لایحتاج درویش ہے ورنہ محتاج اور عاجز ہے۔" (مفتاح العارفین ۴۴)

درویش دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔ دَرویش اور دُرویش۔ پہلے کا مطلب دروازے کے ساتھ لٹکا کھڑا مانگنے والا۔ یہ بھی درست ہے کہ طالب حق حق تعالیٰ کے دروازے پر کھڑا ہدایت و معرفت کے لیے ملتجی ہوتا ہے۔ دوسرے کا مطلب ہے موتی کی طرح قیمتی اور قابل قدر (دُر: موتی' ویش: مانند) وہ آدمی قابل قدر ہوتا ہے جو اپنے لیے حق طلبی کی راہ چن لیتا ہے۔

سلطان صاحبؒ درویش میں یہ صفات دیکھنے کے خواہاں ہیں:

درد

صوفیاء کا خیال ہے کہ عشق کا جذبہ قدسیوں اور انسانوں دونوں میں ہے گو عشق کا انتہائی مرتبہ صرف انسانوں ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ خواجہ عطارؒ فرماتے ہیں:

قدسیاں را عشق ہست و درد نیست
درد را جز آدمی در خورد نیست

"درد اُس قلق اور سوزش دروُنی کو کہتے ہیں جو عاشق فراق محبوب اور آرزوئے وصال میں محسوس کرتا ہے۔"

"انسان کے لیے درد و عشق باہم لازم و ملزوم ہیں۔ موجب ترقی درد ہے......

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرۂ دردت دلِ عطار را"

(عطار)(۸)

راست دینی

درویش کے لیے دین پر قائم رہنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر وہ دین پر قائم نہ رہا تو اُس کی بنیاد ہٹ جائے گی اور وہ گر جائے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ دین میں وہ آزادہ روی اختیار نہیں کرسکتا اس میں گمراہی کا خدشہ ہے۔ دین کی مبادیات پر ایمان جیسی وہ پیغمبر ﷺ سے ملیں درویش کے لیے ضروری ہے تاکہ ان کی روشنی میں آگے اپنی روحانی ترقی کے لیے وہ تمام طریقے استعمال کرے جن کی مرشد نے اجازت دی ہو۔ یا حکم دیا ہو...... صراطِ مستقیم پر چلنا راست دینی ہے۔

وحدانیت

توحید پر ایمان کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ درویش پہلے یہ مان لیتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے۔ وہ ایک ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں وہ بے مثل ہے۔ تمام مذاہب عالم میں توحید کا عقیدہ مشترک ہے۔ التوحید واحد۔ اسلام کی صوفیانہ روایت میں توحید ہی سے ابتداء ہے اور توحید پر ہی انتہا ہوتی ہے۔ مرد

کامل بھی اپنا "مقامِ معلوم" پاکر وحدہٗ لاشریک ہو جاتا ہے۔

یعنی اپنی پیدائش کے لحاظ سے جیسے وہ الگ ناک نقشہ اور استعداد لے کر آیا تھا' اسی طرح اپنے روحانی ارتقاء میں بھی وہ الگ ہی رہتا ہے۔ بشری خصوصیات میں اشتراک تو فطری امر ہے۔

یادِ حق

درویش جب مرشد کی زیرِ نگرانی تربیت پانے کی ابتداء کرتا ہے تو اسے سب سے پہلے ذکر تلقین کیا جاتا ہے۔ اس ذکر کو ہمیشہ کرتے رہنا ہی یادِ حق ہے۔ بعد میں یہی ذکر خلوت و جلوت میں اُس کے لیے حضوری کا سبب بنتا ہے۔

خلافِ شریعت چلنے سے شرمندگی

اِن صفات کی کڑیاں سب آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ درویش ہر وقت یادِ حق میں مصروف رہے گا تو ظاہر ہے کہ خدا اور رسول ﷺ کی نافرمانی پر شرم محسوس کرے گا۔ قرآنی اصطلاح میں وہ اس وقت نفسِ لوامہ کی سطح پر ہوتا ہے یعنی جب کچھ غلط کرتا ہے تو اُس کے اندر اُس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے اور وہ اپنی نازیبا حرکت و عمل پر شرمندہ ہوتا ہے۔

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں درویش اگرچہ فقر میں مبتدی اور نو آموز ہوتا ہے مگر پھر بھی چونکہ وہ اللہ کے راستے پر گامزن ہوتا ہے' اس کا وجود بابرکت ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

بر درِ درویش رو ہر صبح و شام
تاترا حاصل شود مطلب تمام

(ہر صبح و شام درویش کے دروازے پر جا تا کہ تجھے تیرا مطلب پورے کا پورا حاصل ہو جائے)

محک الفقر کلاں میں فرمایا:

"اے عزیز! طالب حق درویش کے پانچ حرف ہیں۔

د ر و ی ش

د دل کے ذکر پر اور حبسِ دم پر دلالت کرتی ہے۔

ر روح کے ذکر پر کہ جس سے پردہ سرِ اسرار کا کھلتا ہے...... ایسا فقیر ماسوائے اللہ کے دیدار سے بیزار ہے۔

و سے واحدانیت حق واضح ہو' محقق' حق پرست ہو۔

ی سے یگانہ' یار اللہ کے ساتھ۔

ش سے شرم رکھے دنیا اور اہل دنیا سے۔

ایسا درویش درویش ہے ورنہ گداگر' خوارتن ریش ہے' خدا سے دور۔"

(ص۴۴۴)

دل کا ذکر اور حبسِ دم

دل کے ذکر کو ذکرِ خفی کہتے ہیں کیونکہ دل میں اللہ' اللہ ھو یا لا الہ الا اللہ کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے کہ زبان ہلتی ہے نہ ہی آواز نکلتی ہے۔ اس کے ساتھ ابتدائی مشقوں میں بعض اوقات سانس روک کر یہ ذکر کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ مرشد کی نگرانی کے بغیر یہ مشقیں نہیں کرنی چاہئیں کیونکہ اس سے بعض اوقات جسمانی طور پر نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سانس روکنے کو حبسِ دم کہتے ہیں۔ حبسِ دم کے ساتھ دل میں ذکر کیا جائے تو اس سے توجہ بڑھتی ہے اور وساوس و اوہام پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ دل میں کچھ حرارت بھی محسوس ہوتی ہے جو جذب کو قائم رکھتی ہے۔

تقریباً ہر طریقے کے درویشوں کو ذکرِ خفی کی اِن مشقوں سے گذارا جاتا ہے اور جب اس پر پختہ ہو جائیں تو آگے نئی مشقیں تلقین کی جاتی ہیں۔

ذکرِ رُوحی

درویش ذکرِ قلبی پر عبور حاصل کر کے ذکرِ روحی کی طرف آتا ہے۔ یہ وہ ذکر ہے کہ بظاہر بندہ کسی کام میں مشغول ہوتا ہے یا کسی کے ساتھ باتیں کر رہا ہوتا ہے مگر اُس کے تحت الشعور کی سطح پر ذکرِ الٰہی جاری رہتا ہے۔ دراصل ذکرِ قلبی یا ذکرِ خفی کی مشق جب انتہا کو پہنچتی ہے تو ذکرِ روحی کا ملکہ ازخود راسخ ہو جاتا ہے۔ نشانی اُس کی یہ ہے کہ جب ذاکر لحہ بھر کے لیے بھی کام سے یا گفتگو سے فارغ ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اُس کے قلب اور اُس کی گہرائیوں میں ذکر بدستور جاری ہے۔ اس مرحلے پر درویش کا حاسۂ وجدان کھل جاتا ہے اور الہام و کشف کے ذریعہ اُس پر اندر اور باہر کے کئی بھید کھلنے لگتے ہیں۔ اب اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ذکر کے بغیر اُس کو کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔

واحدانیت

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' درویش توحید سے ابتداء کرتا ہے مگر عوام کی طرح اِس کے اقرار تک ہی نہیں رہتا بلکہ اب وہ اُسے اپنے ادراک ذہنی وقلبی کا حصہ بنانا چاہتا ہے۔ اس کو بطور ایک روحانی تجربہ دیکھنا چاہتا ہے۔ روحانی واردات کی صورت میں اس کی تحقیق کرنا چاہتا ہے تاکہ یقین حاصل ہو جائے۔ وہ صحیح معنوی میں موحد اور محقق بن کر توحید قولی سے آگے توحید صفاتی و افعالی کی کارکردگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اورحق پرست بن کر اپنے دائرۂ کار میں عمل پیرا رہتا ہے۔

یگانہ' یار اللہ کے ساتھ

درویش کا لگاؤ اللہ سے اس قدر ہوتا ہے کہ اسی کے ساتھ منسلک رہتا ہے اور اسی سے یاری طلب کرتا ہے۔

شرم

دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تعلق رکھتے ہوئے اسے شرم آتی ہے۔ اُس کی

منزل دنیا و مافیہا سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ اگر وہ ان تعلقات میں پھنس جائے تو اُس کی ترقی رک جاتی ہے۔ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اِن تعلقات میں پڑتا ہی نہیں۔ وہ اپنے معاشرہ میں الگ تھلگ نہیں رہ سکتا' صرف ذہنی وقلبی طور پر وہ اِن سے علیحدہ رہتا ہے۔ جیسے حالی نے ایسے لوگوں کے بارے میں کہا ہے۔

رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

دُنیا

''دنیا کے چار حرف ہیں: د ن ی ا

د سے دنیا داری نہیں رکھتے۔ (پیغمبر اور اولیاء اللہ وغیرہ)

ن سے (دنیا) نافرمان فرعون کر دیتی ہے۔

ی سے شیطان کا یار۔

ا سے اظلم اور آدم کش بناتی ہے۔'' (محک الفقر ص ۲۷۵)

دنیاداری

دنیاداری سے مراد وہ تمام ظاہری و باطنی علائق ہیں جو بندے کے کردار کو مسخ کرتے ہیں اور اخلاقی قدروں کو نظر انداز کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے پیغمبروں کی یہ صفت لکھی ہے: ''جان کہ ایک لاکھ چالیس ہزار پیغمبر حضرت آدمؑ سے خاتم النبیین ﷺ تک ہوئے ہیں' سب نے دنیا ترک فرمائی ہے' پس تو ان کے خلاف کیوں کرتا ہے؟'' (ایضاً ۲۷۵)

گویا دنیاداری نہ رکھنے کی بہترین مثال جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ جو عام انسانوں کی طرح دنیا میں رہتے تھے مگر نظر قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی یعنی قرب کے انتہائی مقام پر مرکوز رہتی تھی جو آپ ﷺ کا اصل مقام تھا۔ درویش اپنے طریق میں آپ ﷺ کی پیروی کرتا ہے اور جہاں کہیں جس حال میں ہو' دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیاداری سے الگ رہتا ہے۔

نافرمانی مانند فرعون

دولت و اقتدار کی کشش کے ساتھ اِن کا احساسِ ملکیت چنگے بھلے آدمی کو خدا کا نافرمان بنا دیتا ہے حتیٰ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اُس پر عام قوانین قدرت لاگو نہیں ہوتے۔ ہمارے دور میں بھی ایسے جابر و قاہر انسان موجود ہیں جو خود کو فرعون نہیں تو چھوٹا موٹا خدا ضرور سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہی دور کا ایک عیاش اور مستبد مسلمان بادشاہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک ایسا بندۂ خاص ہے کہ غیبی قوتیں جس کی حفاظت کرتی ہیں۔ جسے ربانی پیغامات بھی ملتے رہتے ہیں اور جس کے پہرے پر خود امام مہدی (غائب) مامور ہیں [۹] پھر دنیا نے بنظر عبرت اس بادشاہ کا انجام دیکھا کہ وہ مارا مارا ملک بہ ملک پھرتا تھا مگر اسے کہیں پناہ نہ ملتی تھی۔ اب ایران کا یہ آخری بادشاہ (آریا مہر) قاہرہ کی ایک مسجد کے حجرہ کے اندر ایک معمولی سی قبر میں پڑا سوتا ہے۔ [۱۰] نافرمانی کا ایسا انجام ہر وقت مردِ حق کی نظر میں رہتا ہے۔ اس لیے وہ دنیا سے صرف اتنا ہی تعلق رکھتا ہے جو شریعت کی رو سے ضروری ہے۔

شیطان کا یار

دنیاداری میں شدید شغف کا مطلب شیطانی قوتوں کی مدد و معاونت کرنا ہے۔ اس وقت جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ ہم روزانہ اخبارات میں اپنے ہاں کے حکمرانوں، ان کے وزیروں اور رئیسوں کی اس سلسلہ میں بدترین مثالیں بچشم خود ملاحظہ کر رہے ہیں مگر سلطان باہوؒ اور بلھے شاہؒ اور سچل سرمستؒ اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور اقبالؒ اور اکابر اولیاء اللہ کی اس سرزمین میں کوئی بھی عبرت نہیں پکڑتا۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔

دنیا...... ظلم اور آدم کش

دولت و اقتدار (یا زر، زمین اور زن) کی خاطر ہر قسم کے ظلم روا رکھے

اوّلیں یہ ہے کہ ایک مومن نہ صرف معاشرے کا ایک معاون کارکن ہو بلکہ اللہ سے توفیق طلب کرے کہ وہ دوسرے مسلمانوں اور مومنوں کی مدد پر مستعد رہے۔ اس کے دو طریقے ہیں۔ عملی تعاون اور دعا۔

نیت صفا

دین میں عمل کا سب سے بڑا اصول صفائی نیت ہے۔ اس میں منافقت کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ اخلاص صرف اپنے گھر، خاندان اور قبیلے کے لیے نہیں بلکہ پورے معاشرے اور آگے بڑھ کر پوری امت کے لیے ہے۔ دین دار ہونے کی علامت خیر اندیشی ہوگی، دین کا پابند مومن خیر سوچے، خیر پر عمل کرے اور ہمیشہ خیر کا خواہاں رہے۔ ایسے آدمی کا وجود جہاں بھی وہ رہے، بابرکت بن جاتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے شکر ادا کیا تھا کہ "اُس نے مجھے بابرکت بنایا میں جہاں کہیں بھی ہوں۔" (قرآن مجید ۱۹:۳۱)

✿.....✿.....✿

ذ

ذکر

مرا ز پیر طریقت نصیحتے یاد است
کہ غیر یادِ خدا ہرچہ ہست برباد است

(مجھے پیر طریقت کی نصیحت یاد ہے کہ خدا کی یاد کے سوا جو کچھ ہے' ضیاع ہے) (نورالہدیٰ خورد ص ۱۱)

نفس کی بدخصالی اور بداندیشی کا علاج صرف ذکر ہے۔ لیکن یہ ذکر ہمیشہ جاری رکھا جائے: ''نفس بہت پلید ہے۔ ذکر دوام کے سوا اور کسی چیز سے پاک نہیں ہوتا۔ یہ تلاوت' نماز' روزے' ریاضت' فتویٰ اور علمی مسائل سے پاک نہیں ہوتا' اس کا علاج صرف ذکرِ دوام ہے۔'' (ایضاً ص ۴۶)

ذکرِ دوام میں ایک تو ہمیشہ جاری رہنے کی شرط ہے اور دوسرے یہ کہ انسان کے ظاہر و باطن پر اس کا غلبہ طاری ہو جائے: ''ذکر دوام کا مطلب یہ ہے کہ دمبدم توحید میں غرق رہے اور اپنے آپ کی ہوش نہ ہو اگرچہ ظاہر میں عام لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہے۔

''ذکر دوام کا تعلق نہ صرف دل سے اور نہ روح اور سر سے ہے بلکہ تمام وجود میں اُس کی جگہ ہے۔ جس طرح سارے وجود میں جان ہے' اسی طرح ذکر کا مقام بھی سارا وجود ہی ہے۔'' (ایضاً)

سلطان صاحبؒ خاص الخاص ذکر کی ہدایت فرماتے ہیں کہ ''اُس سے ایسا

ذوق پیدا ہو جو ازل سے ابد تک رہے اور ذاکر عارف باللہ اور واصل بن جائے۔''

(توفیق ہدایت ص ۴۸)

اب ہیشگی اور غلبہ ذکر کے ساتھ گویا تیسری شرط یہ ہے کہ ذوق و شوق کے ساتھ ذکر کیا جائے تو ذکر کا حق ادا ہوگا۔ اس قسم کے ذکر کو ''ذکر سلطانی'' کہیں گے۔

''واضح رہے کہ کل سات ذکر ہیں: ذکر اللہ' ذکر للہ' ذکر لہ' ذکر ہو ذکرِ سِرِّ ھُوَ' ذکر ھوالحق' ذکر لاَ اِلٰہَ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ۔''

ذکر کرنے کا طریقہ مرشد سکھائے گا۔

پھر فرمایا: ''واضح رہے کہ ذکر کی چار قسمیں ہیں' زبانی' قلبی' رُوحی اور سرّی' زبانی ذاکر سیف زبان ہوتا ہے اور قلبی ذاکر کے دل میں محبت الٰہی کا ایسا داغ ہو جاتا ہے کہ سوائے ذکر الٰہی کے اُسے کسی سے الفت اور محبت نہیں رہتی اور اُس کا قلب تصدیقی ذکر سے زندہ ہو جاتا ہے۔ اور زندگی اور موت میں ہرگز نہیں مرتا اور روحی ذاکر ہمیشہ انبیاء اور اولیاء کی روحوں کا ہم مجلس رہتا ہے اور اُسے نفسانی مجلس نہیں بھاتی اور سری ذاکر پر ظاہری اور باطنی تجلیات کے مشاہدے اس طرح برستے ہیں جیسے بارانِ رحمت کے قطرے۔ جب یہ چاروں ذکر یک بارگی ہوتے ہیں تو عارف باللہ ہو جاتا ہے اور خاک ہو جاتا ہے۔'' (شمس العارفین ص ۲۵)

اِن لطائف (قلب' روح اور سر) کا ذکر بھی مرشد سکھائے گا۔

✿.....✿.....✿

ر

رُوح

صوفیوں، فقیروں اور درویشوں نے اپنے اسلوب حیات میں عمدگی رفعت پیدا کرنے کے لیے جن سطحوں کا ذکر کیا۔ اُس میں پہلی سطح تو نفس کی ہے۔ گمراہ کن تخریبی جبلتوں سے نجات کے لیے اپنی نفسیات درست کرنی پڑتی ہے۔ پھر قلب کی سطح آتی ہے۔ یہ وہ شاہراہ ہے جہاں سے اچھے اور برے قافلے خیالوں کے...... وساوس، اوہام، خطراب، تفکرات، رجحانات، میلانات کے...... گذرتے رہتے ہیں۔ وہاں صرف یہ نظم و ضبط پیدا کرنا ہوتا ہے کہ وہ نفسیاتی توازن کو بگاڑیں نہیں، ویسے گذر جاتے رہیں، تیسری سطح روح کی ہے۔ یہاں معاملہ صفائی کا ہوتا ہے۔ روح کی سطح پر شعور کی وہی روگذرتی ہے جو صاف اور شفاف میلانات کی حامل ہوتی ہے۔ یہاں روح کی جہت روحانی واردات، تجربات و مشاہدات کی طرف متعین ہو جاتی ہے۔ صوفیاء متقدمین درجہ بدرجہ اس ترقی کو تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور تجلیہ روح کہتے تھے۔ سلطان صاحب فرماتے ہیں: ”کسے را کہ روح پلید است چنانچہ روحِ کافراں و منافقاں و اوشاں را نیز روح پلید از صحبت تاثیر، ہر دو یکے است و کسے را کہ روح پاک است آنرا از محاسبہ چہ باک“ (مجالسۃ النبی مرتبہ کے۔ بی نسیم ص ۸۲)

(جس کسی کی روح پلید ہوتی ہے جیسے کافروں اور منافقوں کی اور اُن کی روح بھی جو صحبت تاثیر کی وجہ سے پلید ہوتی ہے۔ دونوں ایک جیسی ہیں۔ اور جس کی روح پاک ہوتی ہے، اُسے محاسبہ کا کیا ڈر؟)

ز

زاری

فقیروں اور درویشوں میں مشہور ہے کہ گناہ اللہ کے حضور گریہ و زاری کرنے اور آنسو بہانے سے دھل جاتے ہیں۔ خاص طور پر وہ گریہ اللہ کے ہاں مقبول ہے جو رات کو کیا جائے۔

سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکایت نقل فرمائی ہے:

”ایک شیخ صالح پارسا راستہ میں جاتا تھا۔ اتفاق سے ایک فاسق اُس کو ملا کہ جس نے تمام عمر فسق و فجور میں برباد کی تھی۔ شیخ صالح نے تعجب سے اُس پر نگاہ کی اور کہا اے خدا مجھے اور اِسے ایک جگہ جمع نہ کرنا۔ اسی عرصہ میں وہ فاسق درگاہ غفورُ الذنوب یں عرض لایا اور عجز کیا اور آنکھوں سے نہریں اشکوں کی جاری کیں اور کہا: یارب! اُس پر رحم کر جس کا تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔

”پس ہاتف کو ندا ہوئی کہ ہم نے دونوں کی دعا قبول کی۔ چونکہ فاسق نے از روئے نیاز اور زاری کے ساتھ امیدواری کا پروردگار کے فضل کے دامن میں ہاتھ مارا۔ وہ دامن عفو میں پوشیدہ کیا گیا اور زاہد نے حقارت کی نظر اُس پر کی، ناکام ہوا اور یہ سمجھا کہ میں اُس سے بہتر ہوں۔ لہٰذا مردود ہوا۔“ (محک الفقر کلاں ص ۳۳۰، ۳۳۱)

س

سُنّتِ عظیم

"طالب صاحب قلب سلیم' جاں بحق تسلیم کے لیے فرض عین اور سنت عظیم ہے کہ از راہِ توفیق قدیم و صراطِ مستقیم' غرق مقام فنا' بقاء و لقاء اور مشرف حضور ضرور اور نظر اللہ میں منظور ہو......" (نور الہدیٰ ص ۱۴۴)

ایک عام مسلمان کے لیے سیدھا سادہ راستہ یہ ہے کہ شریعت کے ظاہر پر عمل کرے اور گناہوں سے بچتا رہے۔ لیکن ایک صاحب شعور بندے کو جو اپنی زندگی کے مقصد پر غور کرتا ہے اور اس مقصد کو پانے کی طلب رکھتا ہے' کچھ اور طرح نیت باندھنی پڑتی ہے۔ لیکن طالب کے لیے شرط ہے کہ وہ قلب سلیم رکھتا ہو اور اپنے مقصد زندگی کے حصول کے لیے اگر جان بھی جائے تو پرواہ نہ کرے۔

ایسے طالب پر فرض ہے کہ وہ نبیوں اور ولیوں کی "سنت عظیم" پر چلے۔ احکام خداوندی سے موافقت اختیار کرتے ہوئے سیدھی راہ پکڑے۔ فنافی اللہ' بقاء باللہ کے مقامات سے گذر کر لقاء الٰہی کی تجلیات کو دیکھے اور حضوری کی یہ کیفیت ہو کہ اُس کی نظر ہر لحہ اللہ پر اور اللہ کی نظر ہر آن اُس پر رہے۔ یہاں وہ مرد کامل یا فقیر کامل کہلائے گا۔ یہ عام سنت نہیں' سنت عظیم ہے اور عظیم لوگوں کے لیے ہے۔

ش

شریعت

"شریعت کے ش سے مراد شوق!" (جامع الاسرار ص ۶۶)

شوق

ایک مومن مسلمان کو شریعت پر شوق سے عمل کرنا چاہیے۔ نیم دلی کے ساتھ نہیں کہ لوگوں کی ملامت سے بچنے کے لیے شریعت کے احکام کی تعمیل کر رہا ہو۔ یہ ایک قسم کی چھپی ہوئی منافقت ہوگی۔ حضور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ فجر اور عشاء کی نمازیں منافقوں پر بھاری ہوتی ہیں۔ یعنی اگرچہ وہ مسجد میں آ جاتے ہیں مگر دل پر بوجھ محسوس کرتے ہیں۔ شریعت پر شوق کے ساتھ عمل کیا جائے تو آگے کچھ راہیں کھلتی ہیں۔ اور شوق بھی تب پیدا ہوتا ہے جب شعوری طور پر ایمان قبول کیا جائے۔ ورنہ بعض لوگ تو ایمان صرف اس لیے رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے۔ گو یہ بھی اللہ کا فضل ہے مگر اصل ایمان وہ ہے جسے خاندانی روایت کے باوجود سوچ سمجھ کر قبول کیا جائے۔ شوق کی ابتداء وہیں سے ہوتی ہے۔

شوق

"شوق کے تین حرف ہیں: ش سے شہادت

و سے معرفت الٰہی کے احوال سے واقفیت
ق سے قتل نفس مراد ہے۔
اس قسم کا شوق رحمانی اور قاتل قربانی ہے۔" (فضل اللقاء ص ۴۰)
شریعت کے ش سے جو شوق تھا' وہ ابتداء تھی اور یہاں شوق کا ش اسی جذبہ کے آخری سرے کی نشاندہی کر رہا ہے۔

شہادت

شہادت کے معنی گواہی کے ہیں۔ اصطلاحاً راہ حق میں جان نثار کرنے کو شہادت کہتے ہیں۔

گواہی کے معنوں میں شہادت یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ حق بات کرے۔

ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دِل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
(اقبالؒ)

اہم بات یہ ہے کہ بندہ اپنے قول و عمل سے حق پر عامل ہو کر اُس کا مظہر ہونے کی شہادت دے۔ اللہ کے نیک بندے جہاں کہیں بھی ہوں حق کے شاہد بن کر رہتے ہیں کیونکہ ہر آن اور ہر جا حق تعالیٰ ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔ صوفیاء کرامؒ نے تلوار کی شہادت کو شہادتِ صغریٰ اور محبت کی شہادت کو شہادت کبریٰ کہا ہے۔[11]

احوالِ معرفت الٰہی

دل میں جب محبت کا جوش ہو تو طلب وصال لازمی نتیجہ ہے۔ طلب وصال کے لیے ہی تو صوفیاء کرام طریقت پر گامزن ہوتے ہیں اور مرشد کی زیر نگرانی روحانی سفر میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور اُس کی قدرت کے افعال سے آشنا ہوتے ہیں۔ پھر وہ اشیاء کے ظواہر کو نہیں دیکھتے بلکہ بواطن کو دیکھتے ہیں۔ اپنے ملنے

والوں کی ظاہری صورتوں کو نہیں دیکھتے' اُن کے دلوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ یوں جب حقائق ان پر کھلتے ہیں تو پھر معرفت الٰہی کے احوال اُن کے تجربے میں آتے ہیں۔ اور وہ یقین کے ساتھ جان لیتے ہیں کہ انبیاء کرام اور اولیاء نے جو کچھ کہا' سچ کہا تھا۔

ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ گو عقل بھی معرفت کے حصول میں مدد دیتی ہے مگر دلائل و آثار کے ذریعہ۔ اور صوفیاءؒ ایمانی معرفت کے خواہاں ہوتے ہیں جو وجدان و کشف کے ذریعہ دلوں پر کھلتی ہے۔

قتل نفس

جہاں شوق ہو وہاں نفسیاتی عوامل رکاوٹ نہیں بنتے بلکہ اہل دل وہ کام کر گذرتے ہیں کہ اہل عقل دیکھتے رہ جاتے ہیں:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
(اقبالؒ)

مقصود و مطلوب کے سامنے اپنی تمنائیں اور آرزوئیں ہیچ' شوق کے سامنے سب آسائشیں اور آرائشیں ختم۔ اپنی ذات (نفس) درمیان سے ایسے ہٹ جاتی ہے جیسے مرگئی' ختم ہوگئی۔ بس ایک طلب ہوتی ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے۔
یہاں نفس سے مراد وہ سطح ہے جسے نفس حیوانی کہتے ہیں یا نفس امارہ' جہاں صرف بدنی احتیاج و آسائش کے لیے تدابیر مدنظر ہوتی ہیں۔

✿……✿……✿

ص

صاحب ذکر

(ذ) ذکر کی شرح میں لطائف نفس، قلب، روح اور سر وغیرہ کا بیان ہوا۔ اِن لطائف میں توجہ کے ساتھ ذکر رواں کیا جاتا ہے۔ جوں جوں اِن لطائف پر ذکر رواں ہوتا ہے، اُس کے اثرات صاحب ذکر کے قول وفعل اور فکر و احساس میں ظاہر ہونے لگتے ہیں اور پہچاننے والے اُسے اُس کے مقام کے حوالے سے پہچان لیتے ہیں۔ سلطان صاحبؒ فرماتے ہیں کہ نفس امارہ کا حامل تو ''ترش رو اور بدخو بدزبان رہتا ہے اگرچہ وہ فارغ التحصیل کیوں نہ ہو۔'' مطلب یہ ہے کہ طالب حق کو ذکر شروع کرنے سے پہلے اپنے نفس کا تزکیہ کرنا چاہیے۔ اپنی طبیعت کو اعتدال پر لانا اور اپنے کردار میں توازن پیدا کرنا چاہیے۔

ذکر کا سب سے پہلے اثر قلب پر ہوتا ہے۔ فرمایا:

''اور صاحب ذکر قلبی اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ وہ اخلاص اور محبت الٰہی سے پُر ہوتا ہے، اُس کے کلام میں اثر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود صاحب تاثیر ہوتا ہے۔ اُس کے کلام سے سامع کو لذت و حلاوت حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ روشن ضمیر ہو جاتا ہے۔

''اور صاحب ذکر روحی اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ اُس کی ہر ایک بات با اخلاص ہوتی ہے۔ دو رنگی اور نفاق سے بالکل پاک صاف ہوتا ہے۔

صاحب تاثیر ہوتا ہے، حق تعالیٰ سے یگانگت رکھتا ہے۔

''اور صاحب سر اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ اُس کے ہر ایک کلام میں مشاہدہ اور اسرار الٰہی کا ذکر ہوتا ہے اُس کی زبان پر اُس کا ورد رہتا ہے۔ اُس کا جسم دنیا میں ہوتا ہے۔ اور اُس کی روح لامکان میں رہتی ہے۔ اُس کے کلام کی تاثیر سے سننے والے کے دل میں ادب و حیا و شرم پیدا ہوتی ہے۔

''اور اہل توفیق اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ عبادت اور اطاعت الٰہی میں رہتا ہے۔ اور ہر وقت عجز و انکسار کرتا ہے۔ اُس کے کلام کی تاثیر سے نفس امارہ کفر اور گناہ سے باز آتا اور مسلمان ہو کر ہمیشہ کے لیے اس کا تابعدار بن جاتا ہے۔ جب یہ تمام صفات و مقامات انسان کے وجود میں مجتمع ہو جاتے ہیں تو اُس وقت اُس کے وجود میں نور الٰہی جلوہ گر ہوتا ہے۔'' (کلید التوحید خورد ص ۸۷)

آخر میں فقیر کامل کا مقام ہے جو ''اگرچہ بظاہر لوگوں سے ہم کلام ہوتا ہے لیکن درحقیقت غرق و استغراق مشاہدہ نور الٰہی میں رہتا ہے۔'' (ایضاً)

ض

ضمیر...... روشن ضمیر

لغت کی رو سے "ضمیر" سے کئی معنی مراد لیے جاتے ہیں جیسے دل و دماغ خیال' احساس' فہم وغیرہ۔ گویا باطن میں احساس اور فہم و ادراک کی ساری قوتیں ضمیر کے مفہوم میں شامل ہیں۔

حضرت سلطان العارفین سلطان باہوؒ کے نزدیک درویش یا مردِ حق کو روشن ضمیر ہونا چاہیے۔ اس روشن ضمیری کے حصول کے لیے دو شرائط ہیں۔ ایک شرط تو یہ ہے کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول کے بارے میں اور کائنات کی پیدائش اور اس کے مقصد کے بارے میں جان لے۔ یہ گویا خود آگاہی اور خدا آگاہی کا علمی مرحلہ ہے۔ رسالہ روحی کے مندرجات کے بارے میں فرمایا کہ جو اِن کو پڑھ لے اور اِن کو یاد رکھے تو "عارف زندہ دل و روشن ضمیر" ہو جائے گا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اپنے تئیں ہوا و ہوس سے پاک کرنے۔ کیونکہ جب تک وہ اپنی زندگی اور گرد و پیش کے ماحول کو اپنی خواہشات کی روشنی میں دیکھتا رہے گا' کبھی حقیقت اشیاء کو ان کی اصلی صورت میں نہ دیکھ سکے گا۔ اُس کی سوچ کبھی معروضی نہ ہوگی اور جسے وہ حق سمجھے گا وہ حق نہ ہوگا۔ فرمایا:

"اور جو کوئی نفس و ہوا سے ناطہ توڑ لیتا ہے وہ روشن ضمیر ہو جاتا ہے۔ دونوں جہان کا تماشا آئینہ کی طرح کرتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے خوش آمدید و مرحبا ہے۔" (کلیدالتوحید خورد ترجمہ کے۔ بی نسیم ص ۳۴)

ط

طالب

"ط سے طالب طمع اندر سے نکال دے اور حرف ط سے طاعت بہت کرے۔

ا سے طالب صادق صدق الاصفا' باوفا' ارادہ صادق رکھے۔

ل سے طالب لایحتاج لاف نہ مارے' نفس سے انصاف دے' ل سے لقاء رب العالمین کے لائق ہو جائے۔

ب سے طالب کے منہ سے بری بات نہ نکلے' چہرہ آئینہ کی طرح ہو۔ ب سے ہمیشہ با ادب رہے۔" (محک الفقراء کلاں ص ۱۶۶)

طالب وہ بندۂ حق ہے جو حق کی راہ پر گامزن ہونے کا خواہش مند ہے۔ اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی راستہ جاننے والے (مرشد) کی خدمت میں جا کر اپنے تزکیہ کے لیے مدد کی درخواست کرے پھر وہ اُس کی ہدایات کی روشنی میں عمل پیرا ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ہر شخص ضروری کوائف کے بغیر اپنے تئیں طالب حق خیال کرلیتا ہے۔ دوسری طرف بعض اہل حلقہ بھی ہر اُس شخص کو طالب متصور کر لیتے ہیں جو بے خیالی میں یا اپنی طبیعت کے لاأبالی پن کی وجہ سے منہ اُٹھائے اہل حلقہ کے پاس چلا آتا ہے۔ سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ ایک مرشد کی حیثیت سے طالب کے لیے صدق و صفا ملحوظ رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں:

طمع سے دُوری

لالچ' حرص اور طمع اور ہوا و ہوس تقریباً ہم معنی ہیں۔ زیادہ میں میخ نکالے

بغیر ہر اُس شخص کو جو حق کا متلاشی ہے جان لینا چاہیے کہ طمع اور حرص سے بڑی برائی راہِ حق میں اور کوئی نہیں۔ ضرورت کی چیزیں تو ہر ایک کو درکار ہیں مگر دیکھا گیا ہے کہ "ہر چہ مادر کار داریم اکثرے در کار نیست" (جو کچھ ہم رکھے ہوئے ہیں' اکثر چیزیں ہمارے استعمال کے لیے ضروری نہیں)۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اِس کی بھی ضرورت ہے۔ اُس کی بھی ضرورت ہے۔ مگر کہیں نہ کہیں کوئی حد قائم کر لینا لازم ہے۔ جب وہ حد آ گئی تو اُس سے آگے طمع اور حرص ہے۔ اس حد سے کوئی آگے بڑھتا ہے تو طالب نہیں رہتا۔

طاعت

احکام شریعت کی اطاعت کی بہت کوشش کرے۔ جو طالب شریعت کے احکام کی پابندی سے گھبراتا ہے' وہ طریقت کو کیسے اختیار کر سکتا ہے۔ شریعت میں تو عذر کی بناء پر مناسب مواقع پر اجازت اور رُخصت ہے مگر اہل حلقہ کے ہاں طریقت کا ڈسپلن تو بہت سخت ہے۔ حضرت سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ کے نصاب فقر میں شریعت کے بغیر طریقت کا کوئی تصور نہیں۔

صدق اور ارادہ صادق

حقیقت یہ ہے کہ طالب کے اندر اگر سچی طلب اور حق کو پالینے کے لیے سچی تڑپ نہ ہو تو کہیں بھی کسی مرشد کے پاس چلا جائے' کچھ حاصل نہ ہوگا۔ "اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور "اللہ اُسے ہدایت دیتا ہے جو چاہتا ہے" کی مطابقت ضروری ہے۔ بندہَ اپنے ضمیر کا جائزہ لے اور سچے دل سے حق کا طالب ہو۔ پھر مرشد کے ہاں جائے تو سچے دل سے یکسو ہو کر ارادہ کرے کہ وہ مرشد کی ہدایات پر عمل کرے گا۔

لایحتاج ہو' لاف زن نہ ہو

طالب کے لیے تکبر اُس کی راہ میں پہاڑ ایسی روکاوٹ ہے جسے وہ عبور

نہ کر سکے گا' یہ ایک طوفانی سمندر ہے جسے پار کرنا اُس کے لیے ناممکن ہے۔ یہاں تو انکسار اور عاجزی درکار ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انکساری ہی علم ہے۔ اہل حلقہ کے داناؤں کے ہاں لاف زنوں کا کوئی کام نہیں بلکہ یہاں تو کتابی علم کو بھی بعض اوقات ایک طرف رکھ دینا پڑتا ہے۔ تب کہیں طالب پر یافت کا دروازہ کھلتا ہے۔

لایحتاج سے مراد یہ ہے کہ وہ احتیاج پوری کرنے کے لیے دنیاداروں کی دوڑ میں شریک نہ ہو۔ ویسے تو ضروریات ہر بشر کو ہیں مگر طالب حق کو کم از کم ذہنی اور جذباتی سطح پر اپنی ضروریات کا اس شدت کے ساتھ احساس نہ ہونا چاہیے کہ طلب حق سے غافل ہو کر رہ جائے۔

یہاں اُس لایحتاج فقیر کی بات نہیں ہو رہی ہے جو اسقدر کامل ہوتا ہے کہ اسے کسی قسم کی کوئی احتیاج نہیں رہتی۔ طالب کی سطح پر تو لایحتاج ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی ضرورت سے زیادہ پریشان نہ ہو اور طلب حق کے لیے کوشش کرتا رہے۔

لائق دیدار ربُّ العالمین

طالب کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ جہانوں کے پروردگار کی پرورش کا کام دیکھ سکے۔ طالب جب اسماء کا ذکر کرتا ہے تو اُن اسماء کے ظہور کے ذریعہ جس طرح حق تعالیٰ پرورش عالم کر رہا ہے اور جیسے اُس کا نظام ربوبیت چل رہا ہے' اُس پر کائنات کے اندر قضا و قدر کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ پیغمبروں اور ولیوں کا ظہور' معاش کا نظام اور امن عالم کا قیام سب ربّ العٰلمین کی ربوبیت کے مظاہر ہیں۔ طالب حق کو سب سے پہلے اسی کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ وہ جب ربّ کی ربوبیت کو دیکھ لیتا ہے تو یہی پروردگار کا دیدار ہے۔ یہ گویا لقاء الٰہی کا پہلا درجہ ہے۔

بدبختی سے دور اور با ادب

عزیز و اقارب' دوست و احباب' افسروں اور حاکموں کا بے جا شکوہ

شکایت کرنا یہ سب بدبختی میں شمار ہوگا۔ ایسے موقع پر شکوہ کرنا جہاں کسی بہتری کی توقع ہو نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے مگر ہر جگہ برائیوں کو موضوع گفتگو بنالینا طالب حق کے لیے بے حد بری بات ہے۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے۔ اور معاف کرے!

اسی طرح باادب رہنے کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کی بہترین اخلاقی اقدار کی پاسداری کی جائے۔ چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی تعظیم کی جائے۔ اس دور کی سب سے بڑی قباحت نئی نسل کا بے ادبی کا رویہ ہے۔ بے ادبی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی معلومات تو شاید حاصل کرے گا مگر علم کو نہ پاسکے گا۔علم وہ ہوتا ہے جو دل و دماغ میں اتر کر شخصیت کا حصہ بن جائے۔ اقبال نے آج سے بہت پہلے اس قباحت کو پیدا ہوتے دیکھ لیا تھا۔

نوجوانے را چوں بینم بے ادب
روزِ من تاریک گردد ہچو شب

(جب میں کسی نوجوان کو بے ادب دیکھتا ہوں تو میرے لیے دن رات کی مانند تاریک ہو جاتا ہے۔) طالب حق بے ادب رہ کر کبھی حق کو نہیں پاسکتا۔ وہ جاہ و مرتبہ تو پاسکتا ہے مگر حق کی معرفت اسے کبھی حاصل نہ ہوگی۔ با ادب بانصیب اور بے ادب بے نصیب۔کل بھی یہ بات سچ تھی اور آج بھی سچ ہے۔

طالب حق کا چہرہ بھی آئینے کی طرح روشن ہونا چاہیے۔نہ وہ بدبختی کی وجہ سے مکروہ ہی نظر آئے اور نہ بے ادبی کی وجہ سے اُس کے خدوخال مسخ ہوں۔ بلکہ اُس کا چہرہ ہی بتا دے کہ وہ اِن قباحتوں سے دور ہے۔

اسی کتاب میں پھر لکھا ہے:

”شرح طالب کی: حرف ط سے طیر وجود اور جو کہ طیر وجود کے ساتھ ہے۔ وہ ایک وجود واجب الوجود کے ساتھ ہے۔

حرف ا سے امان اللہ۔

حرف ل سے لایحتاج

حرف ب سے اپنے ہی وجود کا گوشت کھانے کے علاوہ لذتِ نفس سے بے بہرہ۔“ (محک الفقر کلاں ص ۱۶۴)

طیر وجود

وجود کا معنی ہستی ہے اور ”طیر“ یا طائر سے یہاں ہستی کی حقیقت سمجھ لیجئے جیسی وہ اللہ کے علم میں تھی اور ہے۔

سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ ایک طالب حق کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ اہل حلقہ میں آتے ہی سب سے پہلے تو اپنی ہستی اور پیدائش اور اُس کے مقصد کے بارے میں جان لے۔ حضرت سلطان باہوؒ کے حلقہ فقر میں آتے ہی کسی مرشد سے رسالہ ”روحی“ ضرور پڑھ لینا چاہیے۔ جس میں ان ابدی سوالوں کے جوابات دیئے گئے ہیں: ”یہ کائنات کیوں پیدا کی گئی؟اس کے اندر انسان کی اہمیت و حقیقت کیا ہے؟ بالآخر اُس کا منتہائے مقصود کیا ہے؟ اور یہ مقصد کیسے پورا ہوسکتا ہے؟“

اُسے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اُس کے وجود کا واجب الوجود کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے' کیا تعلق ہے۔ بالآخر بندے کو قرب کا وہ مقام حاصل کرنا ہے جسے حضرت سلطان العارفینؒ استغراق کہتے ہیں۔ جب حضرت سلطان العارفینؒ خود اُس مقام پر پہنچ گئے تو حق تعالیٰ نے فرمایا: ”تو ہمارا عین ذات ہے۔ اور ہم تیری ذات کے عین ہیں۔ حقیقت میں تو ہماری حقیقت ہے اور معرفت میں ہمارا یار ہے۔ اور تو ہو میں یاھو کا بھید بن گیا ہے۔“ (رسالہ روحی)

طالب حق یہ سب کچھ جان کر طریقت اختیار کرتا ہے۔ ابتداء میں ہی انتہا اُس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ چونکہ سفر کا نقشہ سامنے رہتا ہے' اس لیے آگے بڑھنے میں آسانی رہتی ہے۔

امان اللہ

طالب حق اگر اپنی طلب میں سچا ہے تو وہ اللہ کی امان اور حفاظت میں رہتا ہے۔ اولیاء اللہ کے تذکرے اس قسم کی حکایات سے بھرے پڑے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے سلوک سے لے کر انتہاء تک کیسے اُس کی مدد اور حفاظت فرمائی۔ طالب علم یا طالب حق چلتا ہے تو فرشتے اُس کے راستے میں پر بچھا دیتے ہیں' وہ اُس کا بچاؤ کرتے ہیں اور اُس کی رفتار میں سرعت پیدا کرتے ہیں۔

لایحتاج

طالب حق کو صرف حق کو پانا چاہتا ہے' اُسے اور کسی چیز کی حاجت نہیں ہوتی۔

لذت نفس سے بے بہرہ

طالب حق اپنی ہی استعداد اور صلاحیت پر بھروسہ کرتا ہے۔اور ذہنی و جسمانی لذات کو نظر انداز کر کے صرف طلب حق کو مدنظر رکھتا ہے۔ اُسے محنت و ریاضت میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ فرمایا:

ہر کہ بخورد گوشت جانِ خویش را
صد ہزاراں لذتِ درویش را

(جو درویش اپنا ہی گوشت کھاتا ہے' اُسے ہزاروں لذتیں محسوس ہوتی ہیں۔) سب سے بڑی لذت تو یہ ہے کہ وہ طلب کرتا ہے اور پاتا ہے' وہ پاتا ہے اور طلب کرتا ہے۔ یوں وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

''امیر الکونین'' میں حضرت سلطان العارفینؒ طالب کے حروف سے اُس کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں:

''ط سے طالب طوقِ بندگی۔ سرافگندگی اور دوام درحکم حق پسندی۔

ا سے ارادۂ حق' ادب اور جو کچھ سر پر گذرے' اُس سے آہ نہ کرنا۔

ل سے لائق لقا' لایحتاج' لاف زنی نہ کرنے والا۔

ب سے باوفا' باحیا' قلب صفا اور قضا و رضا میں رہنے والا''

(امیر الکونین ص ۹۴)

طوق بندگی' سرافگندگی اور ہمیشہ حق پسندی

طالب حق بننے سے پہلے بندہ بننا ضروری ہے۔ جہاں حق دیکھے' اُسے پسند کرے' اُس کے سامنے سر کو جھکا دے اور ایک بندے کی طرح حکم کو قبول کرے۔ لیکن صرف قبولیت ہی کافی نہیں بلکہ اُس پر مداومت لازم ہے۔

حکم حق میں کسی قسم کی اگر مگر اور چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ حق کے معاملے میں کسی قسم کے تحفظات کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں' حق کسی قسم کی غرض سے بھی مشروط نہیں ہوتا ہے۔ بس حق حق ہے۔ اور طالب حق کو اُسے قبول کرنے کے لیے ہر وقت مستعد رہنا چاہیے۔

ارادۂ حق' ادب اور استقامت

طالب حق کی نیت ٹھیک ہونی چاہیے اور حق کی یافت کے لیے اُس کا ارادہ مصمم ہونا چاہیے۔

طالب جب حق کی تلاش میں نکلے اور اُن لوگوں میں جائے جو حق کا دروازہ کھولنے کے اہل ہوں تو جہاں کہیں اور جو بھی وہ ہوں' طالب کو اُن کے درمیان باادب رہنا چاہیے۔ اس کے لیے وہی قاعدہ ہے جو کسی ادبی شاہکار کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے یعنی دوران مطالعہ تنقیدی رائے زنی معطل یا کچھ دیر کے لیے ملتوی رہے۔ بے شک تنقیدی ملکہ بروئے کار آئے گا مگر مطالعہ اور معائنہ کے بعد...... ابتدا میں بھی ادب ضروری ہے اور بعد میں بھی' یعنی اگر کسی حلقے میں کچھ باتیں قبول خاطر نہ ہوں تو ادب کے ساتھ رخصت کی اجازت لے کر کسی دوسرے حلقہ کی طرف اس طرح رجوع کیا جاسکتا ہے کہ زبان پر شکوہ شکایت نہ

ہو۔ ورنہ عین ممکن ہے' بے ادبی اور گستاخی دیکھ کر دوسرے اہل حلقہ بھی طالب کو رد کردیں۔

راہ حق میں مشکلات پیش آتی ہیں' طلب حق کے لیے سفر اختیار کرنے پڑتے ہیں اور کئی حلقوں میں گھومنا پڑتا ہے' کئی کتب و رسائل کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سب معاملات میں استقامت اختیار کرنی چاہیے۔ یہ استقامت اس قدر ضروری ہے کہ اسے کرامت پر فوقیت دی گئی ہے۔

(الاستقامت فوق الکرامت)

لائق لقاء' لایحتاج اور لاف زنی نہ کرنے والا

طالب حق دراصل اُن حقائق کو بچشم بصیرت دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے جن کا ایک عام مرد مسلمان سے آخرت میں وعدہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا طالب حق کو اپنا تزکیہ اس طرح کرنا چاہیے کہ وہ اپنے دل و دماغ کے آئینے میں اُن باتوں کی حقیقت کو دیکھ سکے جو دراصل روحانی دنیا سے متعلق ہیں۔ مثلاً نظام قدرت میں مخفی قوتوں کی کارکردگی' پیکار خیر و شر' حیات بعدالموت کے بارے میں حق الیقین' الہام و کشف کے ذریعہ تعلیم' کمال انسانیت وغیرہ۔ لائق لقاء وہی بنتا ہے جو اہل حلقہ کے درمیان رہ کر اُن کے نصاب تعلیم و تربیت کی تکمیل کرتا ہے۔

باوفا' باحیا' قلب صفا اور راضی بہ رضا و قضا

باوفا ہونے سے مراد یہ ہے کہ جو عہد اپنے پیر استاد سے کیا ہے' اس کا ایفاء کرے۔ اس کا تعلق تعلیم و آموزش سے ہے۔ جب تک ایک حلقہ میں تعلیم مکمل نہیں ہوتی اور طالب کو اجازت نہیں ملتی' اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔

باحیا ہونے کا تعلق بھی اسی نصیحت سے ہے۔ یک در گیر' و محکم گیر' ایک دروازے پر جاؤ اور مضبوطی سے جمے وہیں کھڑے رہو۔ در در پھرنے کا نتیجہ دھکے کھانا اور حیا گنوانا ہے۔ اس طرح آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔

جب درویش کسی حلقے میں ایک مرشد کے تحت تعلیم پا رہا ہو تو پھر اُسے اپنا دل وسوسوں اور خطرات سے پاک صاف کرلینا چاہیے۔ فقر میں کسی پیر استاد سے تعلیم پانا اور پھر اس کے بارے میں شک کرنا بے حد ضرر رساں ہے۔ لہٰذا طالب حق درویش کو چاہیے کہ قلب صاف رکھے اسی طرح راہ حق میں جس قدر مشکلات پیش آئیں' انہیں خدا کی طرف سے امتحان سمجھے اور تقدیر پر راضی رہے۔ یہ ایک ایسا گر ہے کہ اس کو اپنانے والا قضا و قدر سے سرتابی بھی نہیں کرتا اور اللہ کی رحمت سے محروم بھی نہیں رہتا۔ یوں اُس کا ہر عمل گویا تقدیر کے مطابق ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا:

"لفظ طالب میں بھی چار حرف ط ا ل اور ب ہیں۔

حرف ط سے یہ مراد ہے کہ طالب یک بارگی تین طلاقیں ہوائے نفسانی کو اور تین طلاقیں اس بوڑھی عورت یعنی دنیا کو اور تین طلاقیں انسان کے دشمن شیطان کو دے۔ جب اِن تینوں کو طلاق دے چکے تو پھر توبہ کرنے سے پاک ہو جاتا ہے۔ نیز حرف ط سے مراد یہ ہے کہ اُسے مولا کی طلب ہو اور وہ ثابت قدم ہو جس سے وہ معرفت الٰہی کے لائق ہو۔

حرف ا سے مراد یہ ہے کہ سچے ارادہ سے مولیٰ کا طالب ہو اور حقیقی طور پر ظاہری و باطنی عبادت میں زمین پر کروٹ نہ رکھے۔ ہمیشہ مراقبہ میں مستغرق رہے۔ راہِ راست سے ایک قدم بھی اُدھر اِدھر نہ ہو' اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان تک لٹا دے۔

حرف ل سے یہ مراد ہے کہ لائق اور باحیا ہو۔ خواہشات نفسانی کو ترک کرے۔ اُس کا نفس فنا ہو جائے اور اُس کی روح باقی بن جائے۔ ایسے طالب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش آمدی اور مرحبا کہا جاتا ہے۔

حرف ب سے یہ مراد ہے کہ طالب حق کے بوجھ کو اٹھالے اور باطل کو چھوڑ دے۔ مطلق با ادب ہو۔ مرشد کے حکم کے وقت اپنا اختیار ترک کردے اور

اُس کا ہر حکم ماننے کے لیے ہوشیار رہے۔ چنانچہ اُس پر المرید لا یرید (مرید کی اپنی کوئی خواہش نہیں ہوتی) صادق آئے۔" (کلید التوحید کلاں ص ۹۲)

ترک (تین طلاقیں)، طلب مولا و ثابت قدمی

حضرت سلطان العارفین بار بار طالب کو ہدایت کرتے نظر آتے ہیں کہ اگر وہ حقیقت پسند و حقیقت شناس بننا چاہتا ہے تو دنیاداری میں انہماک چھوڑ دے۔ ہوا و ہوس کو ترک کردے جسے آج کل کے محاورے میں مادی مقاصد کی خاطر چوہا دوڑ کہا جاتا ہے۔ نیز بدی کے خارجی و باطنی عوامل (شیطان) کی یلغار کو پسپا کردے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ طلب حق کی طرف رجوع کر سکے۔ (یہی توبہ ہے)

توبہ کے بعد راہ حق میں ثابت قدمی اختیار کرکے طالب الٰہی بھیدوں کی پہچان کے قابل ہو جاتا ہے۔ (لائق معرفت)

سچا ارادہ، دائمی عبادت اور استقلال

اخلاص نیت اور سچا ارادہ ایک ہی بات ہے۔ "ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں" سب سے بڑی نفسیاتی کمزوری ہے۔ بے یقینی اور تذبذب ایک مرض ہے جس کا علاج مرشد اور اہل حلقہ کی ہم نشینی میں ہے۔

مراقبہ کا معنی نگرانی ہے۔ یہ وہ نگرانی ہے جو بندہ خود پر کرتا ہے ایسے وساوس و اوہام اور ایسے خیالات و افکار سے جو حق کی جستجو اور یافت میں حائل ہوں۔ اپنی حفاظت کرنا مراقبہ ہے۔ یہ وہ مراقبہ ہے جو رات دن کے چوبیس گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے۔ مراقبہ اور طاعت و عبادت لازم و ملزوم ہیں۔

نفس فنا اور روح باقی

پہلا درجہ حیوانی سطح سے اُوپر اُٹھنا ہے (فنائے نفس) دوسری سطح قلب ہے۔ بقول کسے یہ وہ شاہراہ ہے جس پر سے خیالات کے قافلے ہمیشہ گذرتے

رہتے ہیں۔ یہ گذرتے رہیں مگر اِن کے پیچھے نہیں دوڑنا چاہیے۔ آگے تیسرا درجہ روح کا ہے۔ یہاں آدمی کے سامنے بس ایک ارفع مقصد (معرفت الٰہی کی یافت) ہوتا ہے اور بس یہاں طالب حق اخلاق الٰہی کو اپنے کردار میں سموتا ہے۔ حقائق کو ان کی اصلی صورت میں دیکھتا ہے اور اللہ کا منظور نظر ہو جاتا ہے۔

قبولیت حق کی استعداد

روح کی سطح پر طالب حق کو نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ اُس کے بعد اُس پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں یعنی اعلائے کلمۃ الحق اور پیروی حق وغیرہ، ان کو بھی پورا کرتا ہے۔ باطل کو چھوڑ دیتا اور اُس سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیتا ہے۔

طلب حق میں طالب جب تک مرشد کی نگرانی میں زیر تربیت رہتا ہے، با ادب رہتے ہوئے تعمیل ارشاد کے لیے تیار رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس شوق کی راہ میں اُس کی کوئی اور خواہش حائل نہیں ہوتی۔ اُس کی جائز خواہشات کی تسکین بھی معطل و ملتوی رہتی ہے۔ زیر تربیت طالب یا مرید صرف ایک خواہش رکھتا ہے اور وہ ہے حق کی طلب اور اُس کی پہچان۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے روزے کے دوران سب خواہشات کا ترک اور جب وقت آ جائے تو افطاری (اے اللہ میں نے تیرے لیے ہی روزہ رکھا، تیرا حکم مانا اور تیرے ہی رزق سے روزہ کھولتا ہوں) المرید لا یرید۔ مرید جب کمال کو پالیتا ہے تو پھر اُس کے سامنے دوسری صورت حال ہوتی ہے اور صاحب اجازت ہو کر معاشرے میں عام مسلمانوں کی طرح رہن سہن اختیار کرتا ہے اور شرعی اذن سے اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔

آگے چل کر پھر تاکید فرمائی ہے:

"معرفت اور وصال کے طالب کے چار حرف ہیں۔ ط، ا، ل، ب حرف ط سے مراد یہ ہے کہ وہ دنیا اور ماسویٰ اللہ کو طلاق دے۔

ا سے مراد یہ ہے دنیا اور اہل دنیا سے الفت نہ رکھے۔

ل سے مراد یہ ہے کہ لامحتاج اور لائق دیدار ہو کر بھی لاف زنی نہ کرے۔

ب سے یہ مراد ہے کہ با ادب اور بے اختیار ہو' اپنا اختیار مرشد کو دے اور حق پسند ہو۔

جب تک وہ ط سے دنیا کو طلاق نہ دے۔

حرف ا سے مطالب نفسانی کا آرزومند رہے۔

ل سے لادین۔

ب سے بدبخت اور بدنہاد ہوتا ہے۔

جس طالب میں یہ اوصاف ہوں' اُسے یاد بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ جھوٹا اور باعث فساد ہے' جھوٹا طالب بے توفیق ہوتا ہے۔ (کلید التوحید کلاں ۲۴۵)

طالب ایسا ہو

دنیاداری سے دور' مستغنی' با ادب اور فرماں بردار' نیز لاف زن نہ ہو

یہاں اس نفسیاتی کمزوری کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جب طالب حق پر وادات غیبی کا نزول ہوتا ہے تو وہ فطری طور پر اپنے ساتھیوں کو اُن کے متعلق گفتگو میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی بڑائی کی بات بھی اُس کے منہ سے نکل جاتی ہے۔ اس سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ایک طرح کا تکبر اور غرور ہے۔

طلب حق کی بنیاد دین داری پر ہے۔ درحقیقت گہرا مذہبی شعور ہی طلب حق میں شدت اور استقلال پیدا کرتا ہے۔ اگر وہ کوئی دنیاوی غرض لے کر اہل حلقہ میں آئے تو سمجھ لیجئے کہ وہ بدبخت اور بدنہاد ہے۔ اُسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے اسلوب بیان کے بارے میں ایک بار راقم نے لکھا تھا کہ وہ اکثر "ژولیدہ" طرز تحریر (Scatter Method) استعمال فرماتے ہیں اس کی ایک خصوصیت تکرار بھی ہے جو وعظ' نصیحت اور خطابت میں بکثرت موجود ہوتی ہے۔ اسرارالحروف کی شرح کا بھی یہی حال ہے۔ بعض مقامات پر انہی الفاظ میں یا ذرا مختلف جملوں میں نکات معرفت کی دہرائی ملتی ہے۔ "قرب دیدار" میں طالب کے حروف کی شرح کے سلسلہ میں بیان

فرمایا:

"طالب کے چار حروف ہیں:

ط سے یہ مراد ہے کہ وہ طمع نفس اور دکھلاوے کی اطاعت کو تین طلاقیں دے اور تمام طاعتیں ایک گھڑی میں کرے۔ طالب حوصلے کا وسیع ہستی میں ہوشیار' خواب میں بیدار اور مشرف نور دیدار ہونا چاہیے۔ اس قسم کا طالب علم میں عامل' فیض میں فاضل ہوتا ہے اور چاہیے بھی ویسا ہی۔ ورنہ ہزار جاہل کو ایک ہی نگاہ سے دیوانہ بنا دینا کچھ بھی مشکل نہیں۔

ا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے محبت و الفت نہ کرے۔

اور نہ مخلوق سے التجا کرے اور ارادہ سے صاحب تصدیق اور طالب تحقیق بنے۔

ل سے یہ مراد ہے کہ لایحتاج' لائق دیدار پروردگار ہو۔

ب سے یہ مراد ہے کہ وہ باادب' باوفا' دل صفا' باحیا' تصرف مال' عارف باللہ اور باوصال ہو۔" (قرب دیدار ص ۸)

مذکورہ الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ طالب کی خصوصیات دہرائی گئی ہیں۔

ریاکاری سے دوری

طالب حق یا طالب اسرار سلطانی کو دکھلاوے کی عبادت و اطاعت سے دور رہنا چاہیے۔ یہ ریاکاری نفسیاتی کمزوری ہے جو اندر ہی اندر پیدا ہوتی ہے اور لوگ جب تعریف کرتے ہیں تو ایک جھوٹا سرور محسوس ہوتا ہے۔ طالب کے لیے یہ کیفیت ضرر رساں ہے۔

وسعت حوصلہ

ہمت اور حوصلہ فقر میں بہت اہم ہیں۔ "جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ

رکھتے ہیں۔" بعض اوقات ایک درویش ابتدائی واردات مثلاً کشف والہام اور کرامات پر ہی قانع رہ کر بیٹھ رہتا ہے یا جذب کی کیفیت (جسے سکر کہتے ہیں) قبول کرلیتا ہے۔ یہ حالت نشے سے ملتی جلتی ہوتی ہے مگر ترقی رک جاتی ہے۔ طالب حق کو ہر آن ہوشیار اور جو کچھ مرشد کہے اُس پر عمل کے لیے مستعد رہنا چاہیے۔

تصرفِ مال

طالب کو دل اور ہاتھ دونوں کھلے رکھنے چاہیں۔ بخل اور خود غرضی اور خود پسندی حق کی طلب میں حائل ہو جانے والی مذموم خصوصیات ہیں۔

عین الفقر میں فرمایا:

"اور طالب میں بھی چار حرف ہیں۔

ط سے جمیع خلائق' ماسوائے اللہ کو طلاق دینا۔

اُ سے مراد الوہیت و ربوبیت میں پہنچنا' اللہ بس ماسوائے ہوس۔

ل سے لائق روزگار ہونا۔ اور

ب سے مراد ہے بدکاری اور بدی سے بچنا اور صبح سے شام تک باادب رہنا اور ہر وقت بے ریا ہو کر خدائے تعالیٰ کی طلب میں رہنا اور ماسوائے اللہ سب سے ہاتھ دھونا۔

جو شخص یہ اوصاف نہیں رکھتا' وہ نہ مرشد ہے اور نہ طالب بلکہ اُس پر نفس و ہوس غالب ہے۔" (ص ۱۱۲)

تقریباً وہی باتیں دہرا دی گئی ہیں جو پہلے سلطان العارفین کئی جگہ بیان فرما چکے ہیں۔ کچھ نئی باتیں کہی گئی ہیں:

جمیع خلائق' ماسوائے اللہ کو طلاق دینا

ترک' ترک اور ترکِ ترک یعنی ترک میں ریاضت کا نتیجہ یہ ہو کہ ترک کا

خیال بھی جاتا رہے۔

لائق روزگار ہونا

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو بھی اہم سمجھا ہے کہ درویش کو دوسروں کی امداد پر ہی بھروسہ نہیں کرلینا چاہیے بلکہ خود کمائی کے قابل ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ اپنے آپ کو جس قدر بھی متوکل اور "لایحتاج" خیال کرے حقیقی معنوں میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے خواہ طالب ہو یا مرشد اُس کے لیے ضروری ہے کہ "لائق روزگار" ہو۔ تب محتاجی کا اندیشہ ہی رہے گا نہ خدشہ۔

ہر وقت بے ریا ہو کر خدائے تعالیٰ کی طلب میں رہنا

درویشوں کے حلقے میں طالب آئے اور اذکار و اوراد کا معمول رکھے تو یہ خیال نہ کرے کہ لوگ بھی اُسے عابد و زاہد سمجھیں۔ بس اپنے کام سے کام رکھے اور ہر وقت طلب میں رہے۔ ہر آن تیار ہے کہ اُسے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ اور مرشد کے طفیل کہاں سے ہدایت ملتی ہے۔ جہاں سے بھی سبق ملے اسے قبول کرے۔

آخری جملے میں حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے اشارۃً فرمایا کہ طالب اگر مرشد کے مقام تک بھی پہنچ جائے' تب بھی اِن خوبیوں سے بے نیاز نہیں ہو جاتا۔ اگر طالب کے لیے یہ صفات لازم ہیں تو مرشد کے لیے بدرجہ اَتم ضروری ہیں۔

"طالب کو مرد ہونا چاہیے۔" (کلید التوحید کلاں ص ۲۴۵)

محکم الفقراء میں طالب کے حروف سے یہ معنی مراد لیے ہیں:

"ط سے طلب مولا۔

ا سے ارادۂ وصال

ل سے لاف کا نہ مارنا۔

ب سے بے اختیار ہونا اور مرشد پر اعتبار کرنا۔" (محکم الفقراء ص ۷)

یہاں دو مزید باتوں کا ذکر ہے:

ارادۂ وصال

شروع سے ہی نیت طالب حق کی یہ ہونی چاہیے کہ اُسے اللہ تک پہنچنا ہے' اُس سے ملنا ہے۔ نیت یوں ہوتی ہے کہ اگر اُس کی جان بھی چلی جائے تو راہ سے نہیں مڑے گا۔

بے اختیار اور اعتبار

فقیری اور درویشی میں استادی شاگردی ذرا مختلف ہے۔ یہاں درویش کو اپنے مرشد پر مکمل بھروسہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ سب راستے اور اُن کے موڑ اور ان کی اطراف جانتا ہے۔ اس کی ہدایت کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچائے گا تو عمل میں کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ یوں طالب حق کو اپنے سارے اختیارات مرشد کو سونپ کر اُس پہ پورا اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ حافظؒ کا مشہور شعر ہے:

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

(اگر تجھے پیر مغان (مرشد) کہے تو مصلی شراب سے رنگ لے اس لیے کہ سالک منزلوں کی رسم و راہ سے بے خبر نہیں ہوتا ہے۔)

✿.....✿.....✿

ظ

ظہور

فقر و تصوف میں چند بنیادی باتوں کا علم بہت ضروری ہے۔ اور یہی وہ علم ہے کہ جس کا حصول فقیری کی ابتداء میں فرض اور لازم ہے ورنہ اُس کے بغیر آگے کچھ نہ ہو سکے گا یا گمراہی ہوگی۔

علموں باجھ جو کرے فقیری کافر مرے دیوانہ ہو۔

شریعت کا علم اِن بنیادی نکات کے جان لینے کے بعد آتا ہے۔ اس کا حکم بھی وہی ہے۔ علموں باجھ جو کرے فقیری......

یہ علم انسان اور کائنات کی پیدائش یا ظہور سے متعلق ہے۔

اللہ کی ذات ایک تھی' ایک ہے اور ایک رہے گی۔ اُسی نے ہر شے پیدا کی۔ اگرچہ کائنات اور انسان اُس سے الگ نظر آتے ہیں مگر اِن کی پیدائش سے اُس میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ذات الٰہی جیسی تھی' ویسی ہی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکایت نقل فرمائی ہے: "ایک روز کسی مرید نے مرشد سے پوچھا کہ ذات اپنی قدرت سے جس طرح باقی رہنے والی ہے اور کسی شے کا اُس میں دخل نہیں اور دوسری طرف تمام موجودات عالم کو مٹی اور پانی سے پیدا کیا گیا ہے اور سوائے اُس ذات کے کوئی چیز حرکت نہیں کر سکتی۔ پس جہان اور اہل جہان کا سردار جو انسان ہے' کیسے اُس کے بارے میں جان سکتا ہے؟

"مرشد نے جواب دیا کہ ہر وہ چیز جس کو ابتداء و انتہا سے نسبت دی

جاتی ہے' فی الحقیقت کچھ حیثیت نہیں رکھتی اور اُس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر تو کہے کہ عالم کی حرکت وجنبش تو ظاہر ہے' پھر وہ کیا ہے؟ تو (اس کے جواب میں) جان لو کہ عالم ایک موہوم صورت ہے کہ عین عدم میں وجود ظاہر کرتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ آئینہ میں صورت دیکھی جاسکتی ہے جبکہ درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں آدم کی پیدائش کے باعث عالم وجود میں آیا۔ جیسے کوئی زیور سونے سے بناتے ہیں مگر کوئی شخص سونے کا نام نہیں لیتا۔ اسی طرح ذات نے خود کو وجود کے باہمی میل جول میں اس قدر گم کردیا کہ ہماری نظر بالکل ذات پر نہ رہی اور ہم ظاہری وجود کے سوا کچھ نہیں دیکھتے۔

''بے شک اس جگہ زندگی اور موت کی امید ہی چاہیے کہ یوں عالم کی صورت وجود میں آتی ہے لیکن جب باطن میں ذات کا ظہور ہوتا ہے تو پھر وجود ہی رہتا ہے نہ حواس اور عالم ہی رہتا ہے نہ آدم' جیسے آگ لکڑی سے اُٹھتی ہے اور اُسی لکڑی کو راکھ کردیتی ہے۔

''بس خود ہی سمجھ لو۔'' (کلید التوحید کلاں ۲۶۵)

اس حکایت کے مکالمہ میں پیدائش کی حقیقت بیان کردی گئی ہے۔ اس کی مزید تشریح صرف اس قدر ہے کہ ذات تو وہیں ہے جہاں تھی اور ایسی ہی ہے' جیسی تھی۔ یہ کائنات تو اُس کے اسماء وصفات کا عکس ہے۔ اور ذات اپنی جلوہ افروزیوں سے لطف اندوز ہو رہی ہے:

''سبحان اللہ' خاکی عناصر کے اجسام سے' اپنی کامل قدرتوں کے آثار جمال وجلال کے ظہور کے لیے' ہزاروں مظاہر کو آئینہ' باصفا بنائے' اپنے روئے زیبا کا نظارہ کر رہا ہے۔'' (رسالہ روحی شریف)

ہر چند کہ یہ کائنات ایک عکس ہے مگر چونکہ یہ عکس بھی تو اُسی کا ہے' اس لیے ہر طرف وہی ہے: ''خود اپنے آپ سے عشق کا کھیل کھیلتا ہے' خود نظر' خود ناظر اور خود ہی منظور ہے' خود عشق' خود عاشق اور خود ہی معشوق ہے۔ اگر تو اپنے آپ سے پردہ اُٹھا دے تو سب وہی ایک ذات ہے۔ دوئی تمام کی تمام آنکھ کے بھینگے

پن کی وجہ سے ہے۔'' (ایضاً)

ذات سے سب سے پہلے نورِ محمدی ﷺ صادر ہوا: ''جب خدا تعالیٰ نے اپنی خداوندی کا اظہار چاہا تو اپنے اور خاص سے نور آنحضرت ﷺ کا جدا کیا۔''
(محک الفقر کلاں ص ۲۲۰)

اس نور محمد ﷺ سے پے در پے کئی حالتوں سے گذرتی ہوئی یہ کائنات پیدا ہوئی اور اس کائنات میں آخری اور مکمل ظہور انسان ہے۔ چنانچہ نوع انسان میں جامع صفات انسان کامل ﷺ میں ظاہر ہوئیں اور وہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ۔

نور محمدیہ ﷺ بشریت کے عالم میں جس طرح کامل طور پر حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی صورت میں ظاہر ہوا' اسی طرح اسی نور سے خاص الخاص اولیاء اللہ کی ارواح بھی وجود میں آئیں۔

جب ہر انسان نور خداوندی یا نور محمدی کی نشانی ہے تو اب اُس پر لازم ہوا کہ اپنی پیدائش یا ظہور کے مقصد کو سمجھے اور ایسے طریقے اپنائے کہ وہ ظہور کے مصدر (ذات الٰہی) کے ساتھ اپنے تعلق کو جوڑ سکے۔

فقر وتصوف میں مرشد یہی کام کرتے ہیں۔ وہ بتدریج ذکر وفکر اور مراقبات ومشاہدات کے ذریعہ بندوں کو بتاتے اور سکھاتے ہیں کہ اُن کی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور وہ اسے کیسے پاسکتے ہیں:

پیدائش کا مقصد

ذات خداوندی کا مقصد: اسما وصفات کی جلوہ گری

انسان کا مقصد: اس جلوہ گری سے گذر کر ذات کی پہچان۔ یافت ومعرفت

طریق

عشق' آخر میں جا کر معرفت وعشق ایک ہو جاتے ہیں۔

تکمیل

"اور فقر کی منزل میں بارگاہ کبریا سے حکم ہوا کہ تو ہمارا عاشق ہے۔ اس فقیر نے عرض کیا کہ عاجز کو حضرت کبریا کے عشق کی توفیق نہیں ہے۔

"فرمایا: تو ہمارا معشوق ہے۔

"پھر یہ عاجز خاموش رہا' حضرت کبریا کی شعاع کے عکس نے بندہ کو ذرہ کی طرح استغراق کے سمندروں میں مستغرق کردیا۔

"فرمایا: تو ہمارا عین ذات ہے اور ہم تیری ذات کے عین ہیں۔ حقیقت میں تو ہماری حقیقت ہے اور معرفت میں ہمارا یار ہے اور تو ھو میں یاھو کا بھید بن گیا ہے۔" (رسالہ روحی شریف)

✿......✿......✿

8

ع

عارف

"اے طالب! عارف کے چار حرف ہیں: ع ا ر ف

پس حرف ع سے عبادت عین اور عین عبادت اُس کو کہتے ہیں کہ اُس کا ع وحدانیت میں غرق ہو اور اس تجلی سے عین نوراللہ کا پاوے۔ جس نے عین کو پالیا' عین رب کو پہچان لیا۔ اور جس نے عین رب کو پہچانا' عین عارف باللہ ہوگیا۔

اور حرف ا سے دوسرے سے سوائے حق تعالیٰ کے الفت نہ پکڑے۔

اور حرف ر سے راز میں حق الیقین حاصل ہو۔

اور حرف ف سے اُس سے عبادت ظاہری فوت نہ ہو۔

فرض اور واجب اور سنت اور مستحب...... جو اس صفت سے موصوف ہو' رب کا عارف ہے۔" (محک الفقر کلاں ص ۱۴۴)

عین اور عبادت عین

عین سے مراد ذاتِ حق ہے جو ذات واحد بھی ہے۔ اور عملی سلوک میں "عین" کا مطلب ہے: "ذات حق تعالیٰ کے ساتھ اتحاد' ہستیٔ حق میں گم ہو جانا۔ سالک کا ذاتِ حق میں محو ہو جانا اور لذتِ وصال پانا' مقام باللہ میں پہنچنا۔" (۱۲)

عارف کا مقام تکمیل کا مقام ہے۔ جب فقیر اپنے کام میں کامل ہو جاتا ہے تو عارف کہلاتا ہے۔

تب وہ عبادت کرتا ہے تو دیکھ کر عبادت کرتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے حضور میں کھڑا ہوتا ہے۔ وہ الوہیت اور ربوبیت کو دیکھ چکا ہے۔ اُن کی حقیقت کی

معرفت پا چکا ہے۔ "عارف واصل جہاں کہیں آنکھ کھولتا ہے اُس کے دیدار کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا اور غیرت اور خود پرستی کا نقش مٹا دیتا ہے تاکہ مطلق کے ساتھ مطلق ہو جائے۔" (رسالہ روحی)

یوں سمجھ لیجئے کہ یہ گویا اُس کیفیت کا انتہائی مرتبہ ہے جسے حدیث جبرئیل علیہ السلام میں "احسان" کہا گیا ہے۔

اُلفت صرف حق تعالیٰ سے

یہ ہدایت عام مومن سے لے کر تمام مراتب کے فقیروں اور درویشوں کے لیے ہے۔ یہ ایک بنیادی دینی رویہ ہے کہ ہر حال میں اللہ کی طرف دیکھنا ہے۔ عاشق صرف محبوب کی نظر کے اشارہ کا منتظر رہتا ہے۔ اسی طرح عارف کا کوئی کام اللہ کی اُلفت سے باہر نہیں ہوتا۔ وہ اگر کسی چیز اور انسان سے (مال ہو یا اہل و عیال) لگاؤ رکھتا ہے تو صرف اللہ کے حکم سے اور اُسی حد تک جس قدر وہ اجازت دیتا ہے۔

راز میں حق الیقین

روحانی عالم میں بے شمار واردات اور تجلیات کا بیان ملتا ہے۔ وہ فقیروں اور درویشوں کی زبانی سنی جا سکتی ہیں اور اولیاء اللہ کی کتابوں میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ مگر عارف وہ ہوتا ہے جسے خود یہ ولایت مکاشفات و اسرار حاصل ہوتی ہے۔ جس قدر روحانی اسرار ہیں وہ سب اُس کے مشاہدے اور تجربے کا حصہ ہوتے ہیں۔ سنی سنائی اور دوسروں کی دیکھی ہوئی باتوں پر وہ قانع نہیں ہوتا ہے۔ وہ خود دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ وہ صرف دانائے راز نہیں ہوتا بلکہ "صاحب راز" ہوتا ہے۔

عباداتِ ظاہری

بہت درویش ہوتے ہیں جن کا جھکاؤ باطنی علوم اور روحانی معرفت کی طرف اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ توازن میں فرق آ جاتا ہے۔ ظاہر پر عمل اور ظاہری

عبادت میں کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ عارف جہاں روحانی توجہ میں انہماک رکھتا ہے وہاں ظاہری عبادت کی طرف توجہ میں بھی کسی سے پیچھے نظر نہیں آتا۔ شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ ولایت مکاشفات و اسرار کے خاتم تھے مگر شریعت کے علم و عمل میں ظاہری تھے۔ حضرت سلطان باہوؒ مقام حقیقت و معرفت میں کامل تھے مگر شریعت کے سخت پابند یہاں تک کہ اگر کسی فقیر کا عمل شریعت کے خلاف پاتے ہیں تو اُسے رد کرتے ہیں اور اگر کسی کا باطنی تجربہ شریعت کے خلاف دیکھتے ہیں تو اُسے باطل قرار دیتے ہیں۔

عارف باللہ ظاہر و باطن میں کامل ہوتا ہے۔

عقل

"حرف ع سے عاقل اعلیٰ ہو۔

حرف ق سے صاحب قرب حق اور قاہر برنفس ہو اور حرف ل سے لائق لقاء رب العالمین ہو۔" (نور الہدیٰ ۱۳۹)

پیشتر اس کے کہ حضرت سلطان العارفین کے نکات کی تشریح کی جائے عقل کے مفہوم کے بارے میں کچھ تمہیدی اشارات کا بیان ضروری ہے۔ عقل کے لغوی معنی روکنے باندھنے سمجھنے اور تمیز کے ہیں۔ گویا انسان میں عقل بنیادی طور پر ایک ڈسپلن کا ملکہ ہے۔

عقل کا مابعدالطبیعاتی مفہوم بہت وسیع ہے۔ عقل اپنی اصل کے لحاظ سے نورِ حقیقت یا نورِ نبوت ہے۔

"عقل موجودات میں صحیح تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔" اس صحیح تجربے کا حاصل فکر ہے جو مقصودِ اصلی کی جانب بڑھنے کا ذریعہ بنتی ہے کیونکہ عقل بندے کو تمیز سکھاتی ہے اور یہی تمیز فکر کو روشنی عطا کرتی ہے اور فکر آگے بڑھتی ہے۔ اسے سلطان العارفین سلطان باہو "عقل بیدار" کہتے ہیں جبکہ نچلے درجے پر "عقل معاش" ہے جو دنیاداری کے معاملات میں معاون و مددگار ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت

اپنی جگہ ہے۔

عاقلِ اعلیٰ

عقل اپنی بلند سطح پر اعلیٰ اقدار کو پالیتی ہے۔ اور پھر وہ ایسا نور بن جاتی ہے جسے بعض اوقات وجدان یا عرفان کہتے ہیں۔ یہاں اُس خرد کا ذکر نہیں جو بقول اقبال محض "چراغِ رہگذر" ہے بلکہ اُس عقل کا ذکر ہے جو "درونِ خانہ" کے ہنگاموں کی بھی خبر دیتی ہے۔ یہاں عقل فرقان بن جاتی ہے۔

صاحبِ قربِ حق اور قاہر برنفس

انسانی جبلتیں (جن کے مجموعے کو نفس کہیں گے) بے لگام ہوتی ہیں۔ عقل میں چونکہ تمیز کی قوت ہے، وہ اُنہیں تعمیر سیرت کے دوران حد میں رکھتی ہے اور ڈسپلن سکھاتی ہے۔ عقل کا فیضان زیادہ ہوتا ہے تو انسان ضبط ونظم کا پابند ہو جاتا ہے۔ یہی ضبط ونظم ایک قوت بن جاتا ہے۔ اقبال نے بھی کہا:

نفس تو مثل شتر خود پرور است
خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمامِ او بکف
تاشوی گوہر اگر باشی خزف

....

اہل قوت شو ز وردِ یاقوی
تا سوار اُشتر خاکی شوی

(تیرا نفس اونٹ کی طرح خود پرور ہے۔ ساتھ ہی خود پرست، خود سوار اور خودسر ہے۔ مرد بن، اِس کی لگام ہاتھ میں لے تاکہ اگر تو ٹھیکری ہے تو گوہر بن جائے...... یا قوی کا ورد کرتے ہوئے طاقت ور بن جاتا کہ تو اس خاکی اونٹ کا سوار بن جائے)۔

"اہلِ قوت" کو ہی حضرت سلطان العارفین نے "قاہر برنفس" کہا ہے۔

جب درویش اپنے نفس پر فرمان نافذ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر قربِ حق کے احوال و مقامات کی طرف بڑھنے لگتا ہے حتیٰ کہ وہ "صاحب قربِ حق" بن جاتا ہے۔ یعنی ایسا مقرب بن جاتا ہے کہ اِن مرتبے سے اُسے رجعت کا خدشہ نہیں رہتا۔

لائق لقاء رب العالمین

جب تک آدمی میں شعور اور تمیز نہ ہو، دنیا میں ہی آگے بڑھ سکتا ہے نہ دین میں۔ تقلید میں ایک حد تک تو شاید آگے تک چلا جائے مگر آگے ترقی کے لیے تمیز و امتیاز کا شعور ضروری ہے۔ لقاء رب العالمین کی قابلیت عارف میں ہوتی ہے۔ عارف کے لیے عقل وفکر اور شعور و معرفت کا ملکہ ضروری ہے۔

علم

"علم کے تین حروف ہیں: ع ل م
حرف ع سے عین حاصل کرے اور عین حق کے ساتھ واصل ہو۔
حرف ل سے لایحتاج ہو۔
حرف م سے محرمِ اسرارِ پروردگار ہو۔" (نور الہدیٰ ص۱۳۹)

علم کی دو قسمیں ہیں علم ظاہر اور علم باطن۔ علم ظاہر صوفیاء کرامؒ کے نزدیک شریعت اور خصوصاً فقہ وتفسیر و حدیث کا علم ہے اور وہ علم بھی جو روزی کمانے کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ دوسرا علم باطن کہ جو علم کا مغز یا اُس کا مقصود ہے، ایسا علم جس سے انسان کا باطن درست ہو کر اللہ کی طرف رخ کرے۔ نتیجۃً ہمارے علم ظاہر کا رخ بھی اُسی طرف ہو جائے گا۔ یہاں سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے جن خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ علم ظاہر و باطن کا رخ متعین کے بعد حاصل ہوتی ہیں پھر کہیں بندہ عالم کہلانے کا مستحق بنتا ہے۔

عین حاصل کرے اور عین حق کے ساتھ واصل ہو

علم وہ ہے کہ اُس کے ذریعے چند مہارتوں اور چالاکی کی کارستانیوں پر ہی نظر نہ رُک جائے بلکہ علم کے ذریعہ آدمی حقیقت (عین) کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کرے۔ اپنی حقیقت' دوسروں کی حقیقت' ہر شے کی حقیقت۔ اور پھر کسی پیر استاد کی خدمت میں حاضر ہو کر معرفت کے اُس مقام تک پہنچے کہ اُسے خدا ہی خدا نظر آئے ہر شے کے پیچھے' ہر کام کے پیچھے اللہ ہی اللہ۔ جیسے سلطان صاحب کبھی کبھی کہتے ہیں: اللہ بس' باقی ہوس' جب یہ کیفیت ہوگی اور قائم رہے گی تو یہ ''عین حق کے ساتھ'' وصال کا مقام ہے۔

لایحتاج

اکثر اہل علم جب کبھی احتیاج کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں تو علم کو بازار میں لے آتے ہیں اور سر بازار اسے نیلام کرتے ہیں۔ فقر و تصوف کے موضوعات پر بھی کتابیں لکھتے ہیں تو ان کا اجر یا معاوضہ لیتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ اللہ کے ہاں بھی اُن کا اجر ہو اور لوگوں کے سامنے اُن کی فقیری کا بھرم بھی قائم رہے۔

''وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں لیکن دراصل وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں مگر سمجھتے نہیں۔'' (قرآن مجید ۹:۲)

حضرت سلطان العارفینؒ کی نظر میں ''لایحتاج'' وہ غنی فقیر ہے جو خدا سے بھی کچھ نہیں مانگتا۔ وہ اپنے اللہ کی جو سارے جہانوں کا رب ہے' رضا پر قانع ہے۔ اُس نے ربوبیت کی معرفت پالی ہے۔ اس لیے وہ فقر کے اُس مقام پر ہے جہاں ''فقر کو اپنے رب سے کچھ حاجت ہے نہ ہی اُس کے سوا کسی اور سے۔'' علم کا مقصود اگر اس مقام تک رسائی نہیں تو پھر وہ اللہ کے حضور میں کم مرتبہ قرار پاتا ہے۔

محرم اسرارِ پروردگار

علم اگر تجربے اور مشاہدے میں نہ آئے تو وہ صرف معلومات کا ذخیرہ

ہے۔ یہی حال تصوف اور فقیری درویشی کا ہے' اگر اِس کے حقائق بصورت تجربہ وارد نہ ہوں تو پھر محض قیل و قال رہ جاتی ہے۔ علم وہ ہے جو الٰہی بھیدوں کو ظاہر کرے' ان تمام بھیدوں کو جو اللہ اور بندے اور اُس کی تمام مخلوق کے درمیان ہیں۔ جب آدمی ''محرمِ اسرار پروردگار'' یا ''صاحب راز'' ہو جاتا ہے تو پھر علم کی افادیت سامنے آتی ہے۔

مفتاح العارفین میں حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے حروف کے اشارے اور قرآن مجید کے آیات کے حوالے سے علم کا مفہوم واضح کیا ہے۔

''واضح رہے کہ علم کے تین حرف ہیں:

ع سے عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (انسان کو وہ کچھ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا)(۵:۹۶)

ل سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلاً (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں' اُسی کو وکیل پکڑو) (۹:۷۳)

م سے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۴۰:۳۳) (محمد ﷺ تم میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہر شے کا علم ہے۔''

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ

سب علوم اللہ کی طرف سے ہیں اور ان علوم کی کوئی انتہا نہیں' جتنا بھی کوئی علم حاصل کرنے' کچھ نہ کچھ رہ جائے گا۔ پھر جس قدر علوم ہیں ان کی تہیں قیامت تک کھلتی رہیں گی۔ دینی علوم ہوں یا فلسفہ و سائنس' سب کے نئے پہلو' نئے مطالب اور نئے نکات قیامت تک سامنے آتے رہیں گے۔

علم اللہ کی طرف سے ہے تو سب پر اس کا حصول فرض ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

اس کا مفہوم یہ بھی ہے لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا هُوَ اور لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا هُوَ ایک وہی موجود ہے باقی سب اُس کے ناموں اور اُس کی صفتوں کے عکس ہیں۔ جب ایک وہی معبود' موجود اور مقصود ہے تو کسی بھی مقام پر اور کسی بھی حال میں ایک وہی چارہ ساز ہوسکتا ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک آ کر نورِ نبوت و رسالت مکمل طور پر ظاہر ہوگیا۔ اب ہر علم کی راہ وہی سمجھائیں گے۔ یعنی علم کو کیسے عمل میں لایا جائے اور اُس کی جہت کیا ہونی چاہیے۔ جیسے مولانا رومؒ نے فرمایا تھا:

علم را برتن زنی مارے بود
علم را برجاں زنی یارے بود

نفس و بدن کی بے لگام خواہشات کی تسکین و تکمیل کے لیے علم کو اگر استعمال کیا جائے تو پھر وہ سانپ ہے۔ علم کو اگر روح سازی کے لیے کام میں لائیں گے تو مددگار ہو جائے گا۔

محمد رسول ﷺ و خاتم النبیین ﷺ نے ہدایت قرآن کے وسیلے سے پیش کردی: "یقیناً یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو بہت ہی سیدھا ہے اور ایمان والوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں' اس بات کی خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔" (۱۷-۹)

اسی مفتاح العارفین میں سلطان صاحب آگے جا کر فرماتے ہیں: "انبیاء اولیاء اور علمائے کامل کا علم اُلُو الْعِلْمِ دَرَجَات والاعلم ہے۔ جو شخص علم کو سر سے پکڑتا ہے اور علم کا سرع ہے جو عین بخش ہے تو وہ عارف باللہ بن جاتا ہے۔ اور اسے اعلیٰ علیین کے مراتب حاصل ہوتے ہیں اور جو شخص علم کو وسط سے جو کہ ل ہے' پکڑتا

ہے تو اُسے لام لایحتاج بنا دیتا ہے اور وہ لایحتاج ہو جاتا ہے۔ اُس کا دل غنی متقی اور لائق دیدار بن جاتا ہے اور جو علم کو اخیر پر حرف م سے پکڑتا ہے تو م سے مردانِ خدا کا رتبہ بخشتا ہے' وہ صاحب عمل اور صاحب تقویٰ ہو جاتا ہے۔" (۴۰)

پہلے فرمایا تھا کہ ع سے عالم عین حق سے واصل ہو جاتا ہے یہاں اُس پر یہ اضافہ فرمایا کہ وہ عین بخش بھی ہوتا ہے یعنی جس حقیقت تک اُس کے فہم و ادراک یا وجدان کی رسائی ہوئی ہے' اُسے دوسروں کے اذہان و قلوب تک پہنچاتا ہے۔

"لایحتاج" کی شرح پہلے لکھی جاچکی ہے۔ یہاں لایحتاج ہو جانے والے عالم کی دو خوبیاں لکھ دی ہیں یعنی استغنا اور تقویٰ۔

م سے مردانِ خدا کی سی صفات عالم میں پیدا ہو جاتی ہیں یعنی دین کی بہترین اقدار اُس کے عمل میں آجاتی ہیں۔

اِس کے ساتھ علم کی سلبی صفات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ جو شخص حق سے برگشتہ ہو جاتا ہے یعنی منفی رویہ اختیار کرتا ہے وہ۔

"ع سے عاق
ل سے لادین اور
م سے مردود فی النفس ہو جاتا ہے۔" (ص ۴۱)

یعنی نفع بخش علم کے دائرہ سے وہ باہر چلا جاتا ہے۔ دین سے اُس کا تعلق نہیں رہتا اور حیوانی سطح پر اُتر کر خود پرور اور خودغرض ہو جاتا ہے' اسی بات کو سلطان صاحبؒ نے محک الفقر کلاں میں بھی دو مقامات پر دہرایا ہے (ص ۱۲۱' ص ۲۴۸) جبکہ ایجابی صفات کے ضمن میں فرمایا:

"حرف عین سے عارف باللہ
ل سے لایحتاج
م سے محو معرفت"

"محو معرفت" ہونے سے مراد وہی "محرمِ اسرار پروردگار" اور صاحب

"راز" ہونا ہے۔ اسی طرح عقل بیدار میں م رسے "مراجعت بخدا اور نفس سے بازگشت" کا مفہوم واضح فرمایا ہے۔ اور تنبیہ فرمائی ہے کہ "جو ان تینوں حرفوں کو نہیں پہچانتا، اُسے علم کی کنہ ہی معلوم نہیں اور وہ ع سے عاق، ل سے لامذہب اور م سے مردود ہو جاتا ہے۔" (ص ۱۱۷)

اس کے ساتھ علم لدنی کی فوقیت بھی بیان فرمادی: "اگر عالم شخص علم کی تحصیل کرتا رہے تو بارہ سال میں فارغ ہو جاتا ہے، وہ کون سا علم ہے، وہ علم لدنی ہے قولہٗ تعالیٰ وَ عَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (اور ہم نے اُسے اپنے پاس سے علم سکھایا) جس سے علم الف سے علم واضح ہو جاتا ہے اور علم الف قید میں آتا ہے، پھر اسے ظاہری و باطنی علم کے مفہوم کی ضرورت نہیں رہتی۔" (ایضاً)

کلید التوحید کلاں میں فرمایا:

"علم میں تین حرف ہیں۔ علم کے معنی جاننا ہے، جو شخص علم کو سر سے پکڑتا ہے اور علم کا سرع ہے۔

علم کے ع سے عین العنایت، عین الولایت عین الوصال، علم الیقین حاصل ہوتے ہیں۔ علم کا ع خدا رسیدہ بنا دیتا ہے اور باطل سے نکال لاتا ہے۔

ل کا حرف وسطی ہے یہ ل لایحتاج کرتا ہے، ل نفی کا بھی ہے۔ اس سے فنائے نفس حاصل ہوتی ہے۔

جو علم کے م کو جانتا ہے، اُس سے حضرت محمد ﷺ کی مجلس کی ملاقات اُسے نصیب ہوتی ہے۔" (ص ۲۸۴)

ہر مقام کا عین

ہر مقام کی حقیقت علم سے کھل جاتی ہے۔ عنایت، ولایت، ہدایت، وصال اور یقین سب اُس کی روحانی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں جو صحیح معنوں میں علم حاصل کرتا ہے۔

آگے ل سے لایحتاج اور فنائے نفس ایک ہی بات ہے۔ فنائے نفس کا

ثمرہ ہی تو استغنا (لایحتاج) ہے۔

مجلس محمدی ﷺ کا شرف

اب یہاں آ کر "محرم اسرار" "محو معرفت" اور "صاحب راز" ہونے کی حقیقت بھی کھل گئی۔ علم وہ ہے جو حضور ﷺ کی حضوری میں لے جائے۔ وہاں لے جائے جو سارے اسرار، سارے رازوں اور ساری معرفت کا مصدر ہے:

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب
(اقبالؒ)

توفیق الہدایت میں ہدایت فرمائی: "عالم باللہ کو سینہ بسینہ علم کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ ع سے عین تک پہنچا دیتا ہے۔ دل سے لایحتاج کر دیتا ہے اور م سے ہمیشہ کے لیے مجلس محمدی میں داخل کرتا ہے۔" (ص ۱۰۷)

ایک موقع پر م سے "متکلم باللہ" بھی فرمایا یعنی جسے اللہ سے مکالمہ کا شرف حاصل ہو۔ یہ وہی "محرم اسرار پروردگار" ہونے کا مقام ہے۔

غ

غنی

غنی کے دو معنی ہیں۔ ایک تو غنی اُسے کہتے ہیں جو دولت مند ہو اور دوسرے وہ بندہ بھی غنی کہلاتا ہے جسے قناعت پسندی کی بناء پر اطمینانِ قلب حاصل ہو۔ فقر و تصوف میں ''غنی'' موخرالذکر معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قادری فقیر ''غنایت میں غنی ہوتا ہے کیونکہ اُسے یہ بخشش قربِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ غنایت یا استغنا بھی اللہ کا کرم ہے۔ سلطان صاحب ایسے فقیر کو لایحتاج بھی کہتے ہیں۔ یہ سب کامل فقیر کی صفات ہیں۔ فقیری کے بلند ترین مرتبے پر فقیر ''غنی فیض فضل'' ہوتا ہے: ''در نظر ایں چنیں فقیر بادشاہ دنیا' مثل غریب عاجز مفلس مستحق گدا' بے جمعیت پریشاں مثل حقیر است''

(ایسے فقیر کی نظر میں دنیا کا بادشاہ غریب' عاجز' مفلس' بھیک کے لائق اور ایک حقیر مخلوق کی طرح پریشان اور بے جمعیت ہوتا ہے۔) (نور الہدیٰ فارسی ص ۱۶۸)

ف

فاقہ

اپنے اختیار کو ترک کرتے ہوئے پیٹ کو خالی رکھنا اور بھوکا رہنا فاقہ کہلاتا ہے۔ تمام صوفیاء کرام نے کم کھانے کی تلقین فرمائی ہے۔ امیر الکونین میں حضرت

سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے دو شعر نقل کئے ہیں:

تا گلو پُر مشو کہ دیگ نۂ!
آب چنداں مخور کہ ریگ نۂ
چوں معدہ بود خالی از طعام
دراں وقت معراج باشد تمام

(گلے تک غذا مت بھر کہ تو دیگ نہیں ہے' انسان ہے اتنا زیادہ پانی مت پی کہ تو ریت نہیں ہے' انسان ہے۔ جب معدہ طعام سے خالی ہوتا ہے تو فقیر کا عروج کامل ہو جاتا ہے)

ضبط کی ریاضت اور فنائے نفس کی مشق جس قدر خود اختیاری فاقے سے ہوتی ہے' اس قدر کوئی اور وسیلہ موثر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ خوراک آدمی کی بنیادی ضرورت ہے' جب وہ اس طرف دھیان نہیں دیتا تو تمام باطنی طاقتیں یکسو ہو کر روح کی ضرورت کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں اور درویش انہی کے ذریعہ روحانی عروج پاتا ہے۔

ف

فقر

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ اپنے نظریہ و سلوکِ تصوف دونوں کو فقر کہتے ہیں۔ آپ کی ساری کتب کا موضوع یہی ہے اور وہ جو فقر میں کامل و مکمل ہو' اُسے فقیر کامل کا لقب عطا کرتے ہیں۔

حروف کے اشارے سے بھی انہوں نے جابجا فقر کی اقدار' خصوصیات اور لازمی صفات واضح کی ہیں:

''حرف ف سے فقیر کو فرض عین سے فنائے نفس' بقائے قلب بقائے روح اور شفاء بدن اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ہم مجلس صاحب انجمن ہو۔

حرف ق سے قالب قبر' قالب یا قرب' قاتل قہر برنفس' قبلے کی طرف سر بسجود ہو' یہ قاعدۂ فقر کا پہلا حرف ہے۔

اور حرف ر سے رویت بین ربّ العالمین' صاحب حق الیقین اور غالب بر شیطان لعین ہو۔" (نورالہدیٰ ص ۲۳۷)

"حرف ف سے فنائے نفس' نہ وجود میں ہوا رکھے نہ ہوس' اللہ بس

اور حرف ق سے قدرت حق تعالیٰ کے اسرار سے خبردار اور سر سے قدم تک غرق مشاہدہ پروردگار ہو۔

اور حرف ر سے روشن ضمیر' عالم علم تفسیر باتاثیر ہو۔

یہ ہے معنی فقیر برکونین امیر! (ایضاً ص ۲۳۹)

"حرف ف سے علم فقہ سے فنائے نفس کرتا ہے۔

حرف ق سے عالم فقہی قویٔ دین ہونا مراد ہے۔

حرف ر سے عالم فقہ کا ہونا ساتھ ہدایت اور وعظ کے۔"

(محک الفقر کلاں ص ۱۱۴)

"ف سے فیض فضل فیاض حق سے

ق سے قیامت دل سے فراموش نہ کرے۔ اللہ کے قرب کے ساتھ اور طاعت کے ساتھ اور نفس پر قوی اور قادر ہووے۔

ر سے رتبہ کو اختیار نہ کرے سوائے حق کی رضا کے۔" (ایضاً ص ۲۰۵)

"حرف ف سے فنائے نفس اور فاقہ

حرف ق سے قوی ہو دین میں۔

حرف ر سے رنج کو گنج جانے اور گنج نہ لے۔" (ایضاً ص ۲۴۹)

"ف سے فخر

ق سے قرب

ر سے رحمت" (کلید التوحید کلاں ص ۱۵۹)

"ف سے فنائے نفس

ق سے قوت روح

ر سے رحم دل" (ایضاً)

"ف سے دونوں جہان کی فکر سے فارغ یعنی فنائے نفس اسے حاصل ہو۔

ق سے نفس پر قہر اور قرب اللہ

ر سے راستیٔ راہ اور دائمی استغراق" (ایضاً ص ۳۲۷)

"ف سے فنائے نفس ہو نہ وجود میں حرص رہے نہ ہوا۔

ق سے قلب اور قالب دونوں پرنور ہو جائیں

ر سے رحمت نزدیک ہو۔" (اسرار قادری ص ۱۸)

"ف سے مراد نیت میں فرد' غرق مع اللہ اور فنا فی اللہ ہو

ق سے قرب' قوت' قدرت اور جمعیت حاصل ہو۔

ر سے قلب سلیم کے راز حاصل ہوں۔" (ایضاً)

"ف سے مراد فنائے نفس

اور ق سے قرب قبر

اور ر سے روحانیت۔" (عین الفقر ص ۱۷۵)

"ف سے فیض

ق سے قہر نفس

ر سے راستی

نیز

"ف سے فنائے نفس

ق سے قرب حق

اور ر سے راز ربوبیت" (فضل اللقاء ص ۱۶)

"جس فقر کی ف سے فخر' ق سے قرب اور ر سے رحمت حاصل ہو وہ فقر شریعت کے لباس میں اختیاری ہے۔" (اورنگ شاہی ص ۲۴)

"حرف ف سے فنا

ق سے قرب
ر سے راستی راہ
نیز
ف سے فنائے نفس
ق سے قہر برنفس
ر سے راضی برضا و قضا
نیز
ف سے فخر
ق سے قرب
ر سے راز" (توفیق الہدایت ص ۵۹)

فرمایا: فقر کے تین حرف ہیں: ف ق ر
"ہر حرف کو اللہ تعالیٰ سے ہزار عزت اور شرف حاصل ہے"
(نور الہدیٰ ۲۳۷)

سلطان صاحبؒ ہر حرف کے اشارے سے فقر کے ایک اصول، صفت یا قدر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ غور کیا جائے تو ایسے ایک اشارے میں جہانِ معنی کا ایک دلکشا منظر کھلتا نظر آتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک حرف کو لے کر کس قدر روانی و آسانی سے فقر کی ساری خصوصیات کو واضح کر دیا گیا ہے۔

"حرف ف سے فقیر کو فرض عین ہے فنائے نفس، بقائے قلب، لقائے روح اور شفائے بدن ہو۔"

فنائے نفس

متقدمین کی اصطلاحات پڑھ کر ان کے مطالب سے اعراض کرتے ہوئے از خود معنی اخذ کرنا غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ ان کی اصطلاحات سے وہی مفاہیم مراد لیے جانے چاہئیں جن کی وضاحت کے لیے وہ وضع کی گئی تھیں۔ فنائے نفس سے

مراد یہ نہیں ہے کہ نفس اور اس سے متعلقہ تمام قوتوں کا قلع قمع کر دیا جائے۔ نفس کو مارنے سے مراد صرف اس قدر ہے کہ نفسیاتی خامیوں، الجھنوں اور پیچیدگیوں کو رفع کیا جائے نیز ان تمام فطری جبلتوں کو رد کیا جائے جو بدی کی طرف غالب میلان رکھتی ہیں۔ پہلے لوگ اخلاقی و روحانی ترقی کے لیے کسی مردِ کامل کی رہنمائی میں نفس کو بری خواہشات سے پاک کیا کرتے تھے تاکہ وہ اُن کے ذہنی و روحانی ارتقاء میں حائل نہ ہوں۔ گو آج بھی لوگ اپنی ترقی کی خاطر اپنی نفسیات کے تزکیہ و علاج کے لیے کوشاں ضرور ہوتے ہیں مگر اس غرض سے کسی ماہر نفسیات کے پاس جاتے ہیں اور اس کے مشورے پر چلنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس سے کم از کم یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ذات انسانی کا ایک پہلو (نفس) ایک سطح پر ایسا بھی ہے جو آگے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ ہمارے نکتہ نظر سے ہم سے پہلوں کا زندگی اور اس کے ارتقاء کے بارے میں نظریہ زیادہ جامع اور مدبرانہ تھا۔ مگر ہمارے دور کے لوگ محض مادی ترقی اور اس کے رنگ و بو سے لطف اندوز ہونے کے لیے "چند کلیوں پر" ہی قناعت کر کے رہ گئے۔

اگر کوئی فقیری کی طرف مائل ہو تو اسے نفسیاتی خامیوں اور بیماریوں سے نجات حاصل کر کے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی تمام قوتیں ایک مرکز پر آ جاتی ہیں اور اسے مضبوط کرتی ہیں (بقائے قلب) اب وہ اپنی ذات کی اس ارفع سطح تک رسائی پانے کا اہل ہوتا ہے جہاں انسان کے اعلیٰ فطری اصول و مقاصد اس کے روبرو ہوتے ہیں (بقائے روح) اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کی پیدائش کا راز یقینی طور پر یہی تھا کہ ان مقاصد کو حاصل کیا جائے۔

جب انسان کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ اُس کے اندر حیرت انگیز قوت در آئی ہے۔ انسانی بدن کے قویٰ اُس کے قلب و روح کے تابع ہو کر کام کرنے لگتے ہیں حتیٰ کہ بدن کی چھوٹی موٹی بیماریاں اُس کے کام میں کبھی حارج نہیں ہوتیں۔ ("شفاء بدن ہو")

ف سے فیض

محض فنائے نفس سے روحانی زندگی میں کسی بڑی تبدیلی یا ترقی کا امکان کم ہوتا ہے۔ جب تک طالب فقیر کسی جاننے بوجھنے والے کامل بندے کی خدمات سے مستفید نہیں ہوتا' اس کا کام نہیں بنتا۔ ایسے ہی کسی کامل رہبر کے حضور میں حاضر ہونے اور اُس سے رہنمائی کی درخواست کرنے سے اُس کی اپنی جھولی کھل بھی جاتی ہے اور رہبر کی دعاؤں اور توجہ اور ہدایت سے بھر بھی جاتی ہے۔ مرشد کی دعا' برکت' توجہ' نصیحت' مشورہ' نگرانی اور ان کی وجہ سے حاصل ہونے والی روحانی بالیدگی اور نشوونما' ان سب کے لیے ایک ہی عنوان ہے: فیض

مرشد کے دل سے رحمت کا پانی اچھل کر بہنے لگتا ہے تو وہ اپنے آس پاس روحانیت کی کھیتیوں کو سیراب کر دیتا ہے۔ یہی فیض ہے۔

ف سے فقر

یہاں فقر سے مراد روحانی زندگی کا انتہائی مقام نہیں ہے بلکہ مراد ایک نو آموز کی ایسی مسکینی' عاجزی' نیاز مندی اور محتاجی کی کیفیت ہے جو اسے کسی کامل رہبر کے پاس جانے کے لیے بے قرار کر دیتی ہے۔ اور پھر جب وہ مرشد کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو اُس کے دل کی تختی خالی ہوتی ہے۔ مرشد اُس پر جو چاہے لکھتا ہے اُس کی جھولی خالی ہوتی ہے۔ مرشد اپنی برکت سے اُس کو بھر دیتا ہے۔

کوئی بھی جو اپنے تئیں کچھ سمجھ کر کسی مرد کامل کے سامنے جاتا ہے تو کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔ بس فقیری اور انکساری سے ہی کام بنتا ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے چچا شیخ ابو الرضا کی خدمت میں ایک عالم دین حاضر ہوا اور اُن کے وعظ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اُسے مناظرے کی سوجھی: ''حضرت شیخ نے مطلع ہو کر تاثیر کے ذریعے اُس کا علم سلب کر لیا...... نادم ہوئے توبہ کی...... اور کہا کہ

اپنی بات اور عقیدے سے توبہ کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ سے بیعت کر لوں۔ حضرت والد نے اُسے بیعت میں قبول نہ فرمایا اور فرمایا کہ لکھی ہوئی تختیاں کسی کام نہیں آ سکتیں۔'' (۱۳)

ف سے فخر

فقر محتاجی سے شروع ہوتا ہے مگر یہ محتاجی مادی ضروریات کی نہیں بلکہ روحانی دولت کی ہوتی ہے اور انتہا اس کی ''لایحتاج'' کے مقام پر ہوتی ہے جہاں فقیر کامل ہو کر کسی چیز کا محتاج نہیں رہتا کیونکہ اللہ اُس کو سب کچھ دے کر مستغنی کر دیتا ہے۔ اب یہ فقر بندے کے لیے فخر بن جاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''فقر میرا فخر ہے''۔ اس میں آپ کی کاملیت' استغنا' شرف صبر و قناعت نیز معراج کی طرف اشارہ تھا۔ بعد میں آنے والے فقراء اور دراویش نے یہی فقر اختیار کر کے رفعتیں پائیں:

فقر جنیدؒ و بایزیدؒ
تیرا جمال بے نقاب

ف سے فنا فی اللہ

جب بندہ برائی کی طرف لے جانے والی جبلی میلانات و رجحانات کو ختم کر کے احکام خداوندی (شریعت) کی اطاعت شروع کرتا ہے تو یہ فنا فی اللہ کے مقام کی طرف اُس کا پہلا قدم ہوتا ہے۔ پھر وہ کسی مرد کامل کی نگرانی میں ایسے اخلاق اپناتا ہے جو اُس کی روحانی فطرت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُس کا اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا' جینا مرنا سب اللہ کے لیے ہو جاتا ہے۔ دل میں بھی اللہ اور زبان پر بھی اللہ۔ اسی موقع پر کہا گیا ہے کہ جہاں فقر بندے کو پہنچا دیتا ہے وہاں بس اللہ ہی اللہ ہوتا ہے۔ (فَاِذَا تَمَّ الْفَقْرُ فَهُوَ اللّٰه)

ف سے فتح روح

آخر میں فقیر پر روح کے سارے عوالم کھل جاتے ہیں وہ ظاہر کی حقیقتوں کو بھی جان لیتا ہے اور پوشیدہ چیزیں بھی اس پر عیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات اسے فتح کبیر کہا جاتا ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کو معراج حاصل ہوئی اور حیات و کائنات اور اُس سے وراء الوراء حقائق آپ کے سامنے کشف ہوئے' کچھ اسی طرح فقراء کو بھی فتح کبیر حاصل ہوتی ہے اور دین و دنیا کی اسقدر صحیح اور درست جان پہچان ان کو نصیب ہوتی ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے بارے میں فرمایا: ''معرفت گشت است بزمن انجمن'' یعنی نکات معرفت کا مجھ پر ہجوم ہے۔

ق

''حرف ق سے قالب قبرٗ قلب باقربٗ قاتل قہر برنفس قبلے کی طرف سر بسجود ہو۔ یہ ق قاعدۂ فقر کا اوّل حرف ہے۔''

ق سے قلب با قرب

بندے کی دل کی حالت فقیری میں وہ ہو جانی چاہیے جو قرآن مجید میں بیان فرمائی گئی ہے۔ جیسے اس فرمان کا شعور کہ اللہ انسان کی شاہرگ سے بھی زیادہ قریب ہے یا یہ حقیقت کہ تم جہاں کہیں بھی ہوٗ اللہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ یا یہ تسلی کہ انسان جب اللہ کو پکارتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے یا تم علانیہ یا پوشیدہ طور پر جو کچھ کرتے ہوٗ اللہ اُسے جانتا ہے۔ اس کیفیت قرب کو حضوری بھی کہتے ہیں یعنی آدمی جو کچھ بھی کر رہا ہو۔ دل و جان سے اپنے تئیں اللہ کے سامنے حاضر و ناظر سمجھے۔ سلطان صاحبؒ نے اسے قربِ الٰہی بھی کہا ہے۔ یہ کیفیت نوافل کی ادائیگی اور کثرت ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔

ق سے قرب حق

حق اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ہے اور حق ہر اُس سچائی کو بھی کہتے ہیں جو تمام اشیائے جہاں کے باطن میں موجود ہے۔ بندہ پر جب یہ سچائی کھلتی ہے تو وہ حق کے قریب ہو جاتا ہے۔ خالق کائنات کی تخلیقی جہت کے لیے بھی حق کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یا جب بندہ ظاہر و باطن میں اللہ ہی اللہ دیکھنے لگتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ پکار اٹھے۔ ''اناالحق'' تو یہ قرب حق کا انتہائی مقام ہوتا ہے۔ حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہٗ قرب حق کے اس مقام پر کامل تھے۔ لیکن

انہوں نے "اناالحق" کبھی نہ کہا۔ وہ ھوالحق کے قائل نظر آتے ہیں۔

ق سے قرب قبر

رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں موت کو بکثرت یاد کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ بعض لوگ جو ذہنی طور پر تندرست نہ ہوں۔ شاید موت کے بارے میں سوچتے ہوئے مزید مایوسی کا شکار ہو جائیں مگر دینی مزاج رکھنے والے اللہ کے بندے موت کے بارے میں اثباتی سوچ رکھتے ہیں موت اُن کو زندگی کے مقصد سے قرین بلکہ منسلک معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ موت کا لمحہ انہیں اپنی زندگی کی تکمیل کا مقام نظر آتا ہے۔ فقیری مسلک زندگی کو جاوداں سمجھتا ہے اور موت کو صرف ایک مرحلہ قرار دیتا ہے۔ اسی عقیدے کو سلطان صاحبؒ قرب قبر قرار دے رہے ہیں۔

ق سے قہر نفس

نفس پر غلبہ پانا قہر نفس ہے۔ نفسیاتی میلانات اور کیفیات کو ضبط و انقیاد میں لانا فقیری ڈسپلن کا خاصہ ہے۔ یہ اسقدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر فقیری اور درویشی تو دور کی بات ہے۔ عام دنیاداری کی زندگی بھی برباد ہو جاتی ہے۔ دین و دنیا کا کوئی کام قہر نفس کے بغیر سرانجام نہیں پاسکتا۔ البتہ قہر نفس کے طریقے مختلف ہیں۔ فقیروں نے عادات کو ترک کرنے' رسوم سے نجات حاصل کرنے' مشقت کی خو ڈالنے کے لیے طویل ریاضتیں بھی کی ہیں۔ لیکن بعض اوقات محض احکام الٰہی کی پابندی (شریعت) اتباع رسول ﷺ (سنت و اسوۂ حسنہ) اور مرشد کی ہدایات کی تعمیل (طریقت) سے بھی روحانی ڈسپلن حاصل ہو جاتا ہے۔

ق سے قوی دین

فقیر دینی مزاج کا حامل ایک ایسا بندہ ہوتا ہے جو ہر حکم دینی کی باطنی حکمت کو جانتے ہوئے ظاہری عمل بجالانے پر نہایت مستعد ہوتا ہے۔ چنانچہ صوفیاء کرام میں (ناکام درویشوں سے قطع نظر کرتے ہوئے) کامل ترین لوگ جو عام طور

پر قطب ارشاد اور ولی و مرشد بن کر رہے۔ شریعت کے ظواہر کے سختی سے پابند نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فقیر ذکر وفکر اور عبادت کے ذریعہ ہی قوت حاصل کرتا ہے۔

ق سے قوت روح

جسم اور روح اگرچہ بالآخر موت کے مرحلے پر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں مگر دنیاوی زندگی میں جسم کی راہ سے روح تک رسائی حاصل کی جاتی ہے یعنی جسم کے کئی منفی تقاضوں کو الگ کیا جائے تو روح کو تقویت ملتی ہے۔ فقر میں روح ہی وہ مقام اور قوت ہے جہاں اور جس کے ذریعے فقیر روحانی حقائق سے آشنا ہوتا ہے اور بالآخر ایمان کے مکمل ہونے کے وہ نشانات ملتے چلے جاتے ہیں جن کے لیے معرفت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

جب فقیر کو روحانی قوت حاصل ہوتی ہے تو اس سے محیرالعقول کارنامے وجود میں آتے ہیں۔ حضرت سلطان العارفینؒ نے فقر میں تسخیر و تصرف کی قدر کو بہت اہمیت دی ہے۔ فقیر ظاہری و باطنی طور پر اسی قوت روح کی بدولت "سلطان" بن جاتا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف سے بہت سے اختیارات اسے عطا کئے جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے روحانی شعور کی بدولت انفرادی و اجتماعی بہبود انسانیت کے لیے کام میں لاتا ہے۔

ق سے قرار اور جمعیت

انسانی نفسیات میں سب سے بڑا المیہ تضادات' اوہام و وساوس کے الجھاووں اور ذہنی بگاڑ یا انتشار کی موجودگی ہے یہ وہ امراض ہیں جو انسانی کردار کو تباہ کر دیتے ہیں اور انسان زندہ تو ہوتا ہے مگر کسی کام کا نہیں رہتا۔ لیکن فقیری اور درویشی میں جس طرح تربیت کی جاتی ہے۔ اُس سے لازمی طور پر ان امراض کا دفیعہ ہو جاتا ہے ایک اہل نظر مرشد کی رہبری' ذکر وفکر' روحانی معاملات میں انہماک

اور دینی ڈسپلن ایک انسان کی ذات کے تمام مثبت میلانات و رجحانات کو ایک مرکز پر لے آتے ہیں۔ یہ قرار اور جمعیت کا وہ مقام ہے کہ آدمی اس کو اگر حاصل کرلے تو پھر وہ جہاں اور جس شعبے میں عمل پیرا ہوتا ہے کامیاب رہتا ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی کام کرنے کے لیے توجہ کی مرکزیت اور جمعیت خاطر بہت ضروری ہے اور فقیر کو ان دونوں خصوصیات کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

ق سے قلب اور قالب

دونوں پُر نور: رسول کریم ﷺ سے ایک دعا کے چند حصے یوں مروی ہیں:

"اے اللہ! تو میرے دل میں نور عطا کردے اور میری آنکھوں میں نور اور میرے کانوں میں نور پیدا فرمادے اور میری دائیں جانب بھی نور اور بائیں جانب بھی نور اور میرے پیچھے بھی نور اور آگے بھی نور، غرض مجھے سراپا نور بنا دے اور میرے پٹھوں میں نور، گوشت پوست میں نور اور میرے خون میں نور، بالوں میں نور، کھال میں نور (بھردے) اور تو میری زبان میں نور عطا کردے اور میری جان میں نور پیدا کردے اور تو مجھے بہت بڑا نور عطا فرمادے اور سراپا نور بنا دے۔"

"اے اللہ! تو میرے دل میں نور اور میری زبان میں نور پیدا کردے اور میرے کانوں میں نور اور نگاہ میں نور عطا فرمادے اور تو میرے پیچھے بھی نور، میرے آگے بھی نور اور میرے اوپر بھی نور اور نیچے بھی نور غرض ہر طرف نور ہی نور کردے۔ اے میرے اللہ، تو مجھے نور ہی نور عطا کردے۔"(۱۴)

اس دُعا کی قبولیت کا مقام وہ ہے جہاں اللہ بندے کی گفتار، بصارت اور سماعت بن جاتا ہے اور پھر اپنے بندے کو کہتا ہے وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی (اور تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک جس وقت پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی) یا فرمایا: وما ینطق عن الھوی (اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا)

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

جب یہ نور ایک قوت بن کر عمل میں آتا ہے تو اقبال کہتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

"اور حرف ر سے رویت ربّ العلمین بین، صاحب حق الیقین اور غالب بر شیطان لعین ہو۔"

ر سے روحانیت

روحانیت سے وہ تمام امور، وسائل اور طریقے مراد ہیں جو بندے کو "روح" کے قریب کردیں۔ روح کو یہاں ایک ایسا جہان سمجھئے جہاں اللہ ہی اللہ ہے۔ جس کے بارے میں سلطان العارفین سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ نے کئی بار فرمایا ہے کہ اللہ بس باقی ہوس۔

فقر میں انسان آسمانی کتب اور دینی ماحول سے چند بنیادی روحانی امور (عقائد و احکام) کے متعلق کسی قدر آگاہی حاصل کرتا ہے۔ ان امور کو پانے کے لیے راہ، راہبر اور رفیقانِ راہ کو وسیلہ بناتا ہے اور پھر ذکر و فکر، ریاضت و عبادت اور خدمت خلق کے ذریعہ اُس عالم تک رسائی پاتا ہے جسے عالم روحانیت کہتے ہیں۔

روحانیت ایک ایسی جامع اصطلاح ہے کہ اگر فقر کو روحانیت قرار دیا جائے تو بجا ہے۔

ر سے راز ربوبیت

اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک رب ہے۔ تمام جہانوں کی ربوبیت کا راز اور نظام اس اسم کے تحت ہے۔ ظاہر ہے کہ ربوبیت اللہ کی صفت ہے۔ "کوئی بھی صنف موجودات اس کے ہمہ گیر نظام ربوبیت و تربیت سے آزاد و

مستثنیٰ۔"(۱۵)

ربوبیت کا مطلب ہے تربیت: "ایک چیز یا شخص کو درجہ بدرجہ ترقی دیتے اور پرورش کرتے ہوئے اسے درجہ تمام و کمال تک پہنچا دینا۔"(۱۶)

فقر میں بندے پر وہ بھید اور منصوبے کھلتے ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ حیات و کائنات کو اپنی قضا و قدر کے مطابق چلا رہا ہے۔ جب فقیر اتنا کچھ جان لیتا ہے تو پھر اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں رہتا۔ قاضی محمد سلیمان فرماتے ہیں: "انسان کی معرفت کا آغاز صفت ربوبیت سے ہوتا ہے۔ پھر اُسے فرمان روائے مالک کا جلوہ نظر آتا ہیں اس کے بعد عرفانِ الوہیت کے دروازے اُس پر کھلتے ہیں۔"(۱۷)

فقر میں راز ربوبیت کا ماننا اس لیے ضروری ہے کہ "دعوت و ہدایت رجوع و رغبت اور استقرار و انتہا کے وہ مدارج ہیں جو جودِ ربوبیت سے پل رہے بڑھ رہے اور پھل رہے ہیں۔"(۱۸)

فقر میں راز ربوبیت کو جاننے سے مراد یہ بھی ہے کہ ایک تو فقیر رب العلمین پر صدق و یقین کے ساتھ ایمان لائے اور پھر اپنی تربیت باطنی کے لیے اپنے مربیوں کو پہچانے۔ یعنی رب کے رسولوں کو اور رب کے ولیوں اور اُس کے اذن سے کام کرنے والے مرشدوں کو۔ جو اُس کو دنیا و آخرت کے رنگ ڈھنگ اور انفرادی و اجتماعی ارتقاء کے درجات سے آگاہ رکھیں گے۔

ر سے رازِ رحمت

اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم ہے۔ "رحمٰن اور رحیم دونوں کا اشتقاق رحمت سے ہے۔"

"حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجا گیا اور خود اپنی ذات کے لیے اللہ نے فرمایا۔ کتب علیٰ نفسہِ الرحمۃ اور یہ رحمت "علم الٰہی کی طرح ہر شے پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔"

قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ نے رحمت سے متعلق آیات نقل کرتے ہوئے فرمایا "آیات بالا کی وسعت معانی پر تدبر کرو۔ معلوم ہو جائے گا کہ نظام عالم اسی رحمت سے ہے اور قوام سموات والارض بھی اسی رحمت سے ہے۔"

تمام انسانی رشتے اور طور طریق اسی رحمت کی بناء پر قائم ہیں۔ فقیر کے لیے رحمت کے ان رازوں سے آگاہی ضروری ہے: "اس اسم (رحیم) سے تخلق پیدا کرنے والوں کو خود اپنے اندر بھی رحم پیدا کرنا چاہیے۔ سینہ میں ایسا دل ہونا چاہیے جو کسی کی حالت پر پگھل جائے۔ دل میں ایسا درد ہونا چاہیے جو ناکس و درماندہ انسانوں کی حالت کا احساس کرتا ہو۔

کرو مہربانی تم اہل زمین پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر" (۱۹)

اسی حقیقت کا شعور "رازِ رحمت" ہے۔

ر سے رحم دل

حضور رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: زمین والوں پر رحم کرو تاکہ آسمان میں تم پر رحم کیا جائے۔" نیز فرمایا: "جو کوئی چھوٹے پر رحم نہیں کرتا جو بڑے کی توقیر نہیں کرتا۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

رحمٰن کے اسم کی شرح کے آخر میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے فرمایا ہے: "اگر اس اسم سے تخلق کی آرزو ہو تو ضروری ہے کہ ہمدردی عامہ اور خیر خواہی تامہ کا خوگر بنے' دلسوزی و شفقت کا آئینہ ہو۔ تربیت ناقصاں اور تعلیم جاہلاں کو شیوہ بنائے اور اندریں باب دشمن و دوست سب کے لیے دروازہ کھلا رکھے اور اس طریق میں بھی رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ کی نُصرت و رعایت کو شمع راہ سمجھے۔"(۲۰)

یہی رحم دلی ہے۔

ر سے رویت حق

رویت حق کے معنی ہیں حق کو دیکھ لینا۔ حق اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے اور لغت میں اس کے کئی معنی ہیں۔ ان سب معانی پر غور کیا جائے تو حق سے مراد حقائق معرفت ہیں۔ لہٰذا فقیر کو کہا جاتا ہے کہ ''ان حقائق پر یقین کرو' حقائق کو تلاش کرو' حق کے پیچھے لگ چلو' حق مانگو اور حق کو ہی پکارو۔''

جناب قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ نے اسم حق کی شرح کے آخر میں لکھا:

''اے اہل ایمان۔ حق وہیں سے ملے گا جو خود حق ہے۔ قرآن حمید اور رسول پاک ﷺ کے سوا حق اور کہاں؟ لوگ مشرق و مغرب میں بھاگے بھاگے پھرتے ہیں مگر دربار مصطفوی ﷺ کے سوا حق اور جگہ نہ ملے گا۔'' (۲۱)

فقر کی راہ پر چلنے والا حق کو دیکھنے کی صلاحیت پالیتا ہے کیونکہ وہ نبیوں اور ولیوں کے راستے پر چلتا ہے۔

ر سے رویت رب العلمین

مراد یہ ہے کہ صرف فقر کا دائرہ ہی ہے جس میں آ کر بندہ کائنات کے نظام ربوبیت کے پیچھے رب العلمین کو دیکھ لیتا ہے۔ یعنی اسے حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کے سارے مربی گو بہت عالی مرتبت ہیں مگر یہ رب العلمین کے تحت سب وسائل و وسائط ہیں۔ کارفرمائے اصلی ذات رب العلمین ہی ہے۔

ر سے رتبہ روز قیامت

قیامت اور روز قیامت غیب کی خبروں میں سے ہیں جن پر بندۂ مومن ایمان لاتا ہے۔ مگر ایمان کی تکمیل یہ ہے کہ ان غیب کی خبروں کی حقیقت اور صداقت پر اسے حق الیقین حاصل ہو جائے۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ قیامت کے قائم ہونے میں اللہ کی کیا مصلحت و حکمت ہے۔ آدمی جب احادیث رسول اللہ ﷺ میں اخبار قیامت کو پڑھتا ہے تو انسان کے مقصد حیات سے لے کر

اللہ کی عظمت و جبروت تک کو اپنے تخیل میں دیکھ لیتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ کا دربار ہوگا۔ سب اُس کے سامنے حاضر ہوں گے۔ ان تمام امور کو جنھیں وہ غیب اور غائب سمجھتے تھے' دیکھ رہے ہوں گے۔

فقر کے طالب کو روز قیامت کا رتبہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ان حقائق معرفت میں سے ایک ہے جس کے جانے بغیر اس کا شعور ناقص رہتا ہے اور اسے فتح کبیر حاصل نہیں ہوتی۔

ر سے راستی راہ یعنی دائمی استغراق

راہ کی راستی وہ شعور ہے جو کبھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔ فقیر جہاں بھی ہے' اللہ کے ساتھ ہے اور اللہ اُس کے ساتھ ہے۔ وہ اللہ کا ذکر کر رہا ہے اور اللہ اسے اپنی نظر میں رکھے ہوئے ہے۔ وہ اللہ کے حضور میں حاضر ہے اور تمام الٰہی قوتیں اس کے سامنے حاضر ہیں۔ حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ اس قسم کی معیت' منظوری اور حاضری کو استغراق کہتے ہیں۔ فقر کے راستے کی سب سے بڑی راستی یہی ہے۔ اس استغراق کے آگے کئی درجے ہیں جنھیں وہی جان سکتے ہیں جو وہاں تک پہنچے۔ سلطان صاحب جب فقر کی منزل تک پہنچے تو فرمایا:

''پرتو شعاع حضرت کبریا بندہ را ذرہ وار در ابحارِ استغراق مستغرق ساخت''
(حضرت کبریا کی شعاع کے عکس نے بندہ کو ذرہ کی طرح استغراق کے سمندروں میں مستغرق کردیا) (روحی)

ر سے رہنمائے خلق

فقر کی ر یہاں مرشد کے مقام کے وقوع کا کھلا نشان ہے۔ اس ر پر پہنچ کر فقیر خلقت کی رہنمائی کا منصب پالیتا ہے۔ یہاں وہ خلافت کا مستحق ٹھہرتا ہے اور خلافت کا مستحق وہی ہوتا ہے جو عالم باعمل ہو کیونکہ اس نے خلقت کے درمیان نمونہ بن کر رہنا ہے۔

یہاں ف ق ر کی صفات فقیر کی ذات میں یکجا ہو جاتی ہیں جیسے فرمایا:

"فقر کے تین حرف ہیں ف۔ ق۔ ر

"حرف ف سے فقیر فنائے نفس، نہ وجود میں ہوا رکھے نہ ہوس۔ اللہ بس۔

"اور حرف ق سے قدرتِ حق تعالیٰ کے اسرار سے خبردار اور سر سے قدم تک غرق مشاہدۂ پروردگار۔

"اور حرف ر سے روشن ضمیر، عالم علم تفسیر با تاثیر۔

یہ ہے معنی فقیر بر کونین امیر!

"فقیر کامل کو چاہیے کہ ہر روز طالب کو ایک نیا مرتبہ عظیم اور نعمت نعیم عطا کرتا رہے تاکہ طالب راہ سلوک میں بے جمعیت، پریشان و ملولِ خاطر نہ ہو جائے اور مشاہدۂ حضور میں غرق رہے۔

"طالب صاحب تحقیق ہو اور مرشد اہل توفیق!

"برکت اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر

باہو فقر را دریافتہ از مصطفٰے ﷺ

واقف اسرار شد فضل از الٰہ

(باہو کو فقر محمد مصطفٰے ﷺ سے ملا۔ اور وہ اللہ کے فضل سے فقر کے تمام اسرار سے واقف ہوا)

"ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْم

(یہ فضل اللہ کا ہے، دیوے جس کو چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے)

"ہزاراں ہزار لوگ محض فقر کے نام کو پہنچے۔ ہزاروں میں کوئی ایک شخص ایسا ہوا جسے فقر حاصل ہوا۔ جس نے فقر کو دیکھا اور وہ فقر کی لذت سے شاد کام ہوا۔ اِذَا تَمَّ الْفَقْرُ فَهُوَ اللّٰہ (جب فقر مکمل ہوا تو بس اللہ ہی اللہ نظر آیا)"

(نور الہدیٰ ص ۲۳۹)

تنبیہ

اور جو فقر کی منزل پہ معیار قائم نہ رکھ سکا تو اسے
ف سے فضیحت حاصل ہوئی جیسے فرعون کو
ق سے قہر خدا اس پر نازل ہوا جیسے قارون پر
ر سے رسوائی ملی جیسے ابلیس کو جو مردود ٹھہرا۔ (نور الہدیٰ ص ۲۳۷)

فقیر

فقر کے سارے اسرار اور سارے بھید اور ساری خصوصیات فقیر کے لیے ہیں:

"فقیر کے لیے ایک الف اور چار ب چاہئیں:

الف!

ب: اوّل: برکت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوم: بنائے اسلام

سوم: بدی سے اجتناب

چہارم: نفس ہوا اور خواہشات کو بند رکھنا۔

اور سات ت چاہئیں:

ت: اوّل: ترک دنیا

دوم: توکل

سوم: تکبیر تحریمہ

چہارم: تواضع

پنجم: تسلیم

ششم: ترک تکبر و غرور

ہفتم: تیاریٔ موت

اللہ بس ماسوائے اللہ ہوس۔" (عین الفقر ۱۹۱)

الف: اللہ

"اکو الف تینوں درکار"

از ذات حق تعالیٰ اعلام بے نو را
گر عاشق تو مائی کن ترک ماسوا را

ما ذاتِ ذوالجلالیم و از کبریا کمالیم
ما شاہِ بے عطائیم از ماجو تو مارا

(دیوانِ باہوؒ)

(ذات حق تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہو رہا ہے: اگر تو ہمارا عاشق ہے' تو ماسوا کو ترک کر دے! ہم ذات ذوالجلال ہیں اور کبریائی میں کمال پر ہیں ہم بے حد عطا کرنے والے ہیں۔ ہمارے پاس ہمیں ہی ڈھونڈ!)

ب برکت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کی ذات تو ورالوراء ہے۔ انسانی پہنچ تو زیادہ سے زیادہ اس کے نام تک یا ذات کے اس سرے تک جہاں سے ظہور ہو رہا ہے' محدود ہے۔ آگے استغراق کے سمندر ہیں' اُس عالم میں اُس شعور کے ساتھ جو کچھ حاصل ہوتا ہے' فقیر کے سینہ میں رہتا ہے۔

حضرت شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی کی دعا "حزب الدور الاعلیٰ" یا حزب الوقایہ لِمَن اراد الولایۃ" اس کلمے کے ساتھ شروع ہوتی ہے:

اَللّٰهُمَّ يَاحَيُّ يَاقَيُّوْمُ بِكَ تَحصَّنتُ فَاَحْمِنِىْ بِحِمَايَةِ كِفَايَةِ وَقَايَةِ حَقِيقَةِ بُرْهَانِ حِرْزِ اَمَانِ بِسْمِ اللّٰه

سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک بیت کے شروع مصرع میں فرماتے

ہیں۔ ب: بسم اللہ' اسم اللہ دا ایہہ بھی گہنا بھاری ہو۔

ب (بسم اللہ
بسم اللہ ہی اللہ کا اسم ہے
یہ بھی ایک بھاری زیور ہے)

بنائے اسلام

بناء سے مراد اگر مصدر و منبع ہے تو وہ اللہ' اُس کا رسول ﷺ اور قرآن ہیں۔ فقیر ان کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔

اگر بنائے اسلام سے مراد ارکانِ اسلام ہیں تو ظاہر ہے کہ فقیر اگر کامل ہے تو وہ شریعت کے خلاف کبھی نہ ہوگا بلکہ اُس کا ہر عمل شریعت کے مطابق ہوگا۔

بدی سے اجتناب

خود برائی سے بچنا اور برائی کی جگہ اور وقت اور اثرات سے بچنا دینی اصطلاح میں تقویٰ کہلاتا ہے۔ وَاِذَا مَرُّوْ بِاللَّغْوِ مَرُّوْ كِرَامًا۔ مومنوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جب لغویات سے ان کا گذر ہوتا ہے تو وہ اُس سے بلند ہو کر گذر جاتے ہیں۔ یہ صفت فقیر میں تو بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔

ہوا و ہوس سے دوری

نفس امارہ جو انسان کی ضرر رساں جبلتوں اور تباہ کن خواہشات کا حامل ہے۔ ہمیشہ حرص و ہوا کی تسکین کا حکم دیتا ہے۔ اگر آدمی خواہشات کو بے لگام چھوڑ دے اور ان کی تعمیل میں لگ جائے تو اُس کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

فقیر اسی نفس امارہ سے اوپر اٹھتا ہے اور نفس کی اُس سطح پر پہنچتا ہے جہاں جمعیت اور اطمینان ہے۔ پوری شخصیت یکسو ہو کر اللہ کے حضور میں حاضر و ناظر ہو جاتی ہے۔

ت: ترک دنیا

وہی بات جس کا کئی بار ذکر ہو چکا ہے کہ فقیر دنیا میں رہتا ہے مگر دنیا میں نہیں رہتا یعنی دنیا کے کام کرتا ہے اور دوسروں سے زیادہ انہماک کے ساتھ انہیں سرانجام دیتا ہے مگر ان معنوں میں وہ ان سے الگ ہوتا ہے کہ اُس کی نظر اللہ پر ہوتی ہے اور وہ اس لیے دنیا میں مصروف کار ہوتا ہے کہ اللہ کا حکم یہی ہے۔

توکل

چونکہ اللہ نے قرآن میں توکل حکم دیا ہے اس لیے صوفیاء کرام نے اس کو بہت اہمیت دی ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵:۲۳)

(اور اگر تم مومن ہو تو اللہ پر بھروسا کرو)

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۱۴:۱۲)

(اور توکل کرنے والوں کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے)

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۹:۵۱)

(اور مومنوں کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے)

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (۶۵:۳)

(جس نے اللہ پر بھروسہ کیا تو پھر وہی اس کے لیے کافی ہے)

و دیگر آیات (۲۶-۲۱۷، ۲۵-۵۸، ۴-۸۱) وغیرہ

خاص لوگوں (فقیروں اور درویشوں) کا توکل بقول ابوالعباس بن عطا رحمۃ اللہ یہ ہے: "جس نے غیر اللہ کی خاطر اللہ پر بھروسہ کیا، اُس نے توکل میں ہوتے ہوئے بھی توکل نہیں کیا تا آنکہ وہ اللہ پر توکل اللہ کی مدد سے اور اللہ کی خاطر کرے اور اللہ پر توکل کرنے میں کسی اور سبب کی خاطر توکل کرنے والا نہ ہو"

خاص الخاص لوگوں (فقراء کاملین) کے توکل کے بارے میں ابوعبداللہ بن الجلاءؒ نے کہا "خدائے واحد کے پاس پناہ لینا توکل ہے" یا جنید رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا:

"تمام حالات میں دل کا اللہ پر اعتماد کرنا توکل ہے۔" (۲۲)

تکبیر تحریمہ

نماز باجماعت کھڑی ہو تو جو تکبیر پڑھی جاتی ہے اسے تکبیر تحریمہ کہتے ہیں۔ اب اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فقیر ہمیشہ نماز جماعت میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ ہی شامل ہو جاتا ہے۔ یا اس کو اگر وسیع معنوں میں لیں تو اس کا مطلب یوں سمجھئے کہ فقیر سب ارکان عبادت بروقت ادا کرتا ہے۔

تواضع

تواضع کا معنی ہے عجز و انکسار اور مہربانی وغیرہ فقیر بقائمی ہوش وحواس کبھی بڑ نہیں مارتا بلکہ ہمیشہ انکساری اختیار کرتا ہے۔ خاص طور پر عوام سے بات کرتے ہوئے فقیر بہت نرم لہجہ استعمال کرتا ہے اور عام رویہ میں بھی تواضع کا دامن نہیں چھوڑتا۔

تسلیم

لوگوں کے ساتھ تواضع اور اللہ کے حضور تسلیم۔ تسلیم کا دوسرا نام رضا ہے یعنی اللہ کی قضا پر راضی رہنا۔ "مقامات میں سے رضا آخری مقام ہے۔ اس کے بعد رضا کا تقاضا یہ ہے کہ بندے پر اربابِ قلوب کی کیفیات کا ورود ہو، غیب کا مطالعہ کرے اور اذکار کی صفائی اور حقائق احوال کی خاطر اپنے اسرار کو مہذب بنائے۔

ترکِ تکبر و غرور

تکبر کے معنی ہیں کہ آدمی بڑا نہ ہو مگر اپنے تئیں بڑا سمجھے یا ظاہر کرے۔

غرور کے معنی ہیں دھوکا۔ کسی کو دھوکا ہو جائے کہ وہ بڑا ہے اور ایسا ہی اپنے تئیں ظاہر کرے تو وہ مغرور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فقیر کو پہلے ہی قدم پر ان دو مذموم صفات سے اپنے تئیں پاک کرنا پڑتا ہے۔

تیاریٔ موت

فقیر ہر وقت مرنے کے لیے تیار ہے۔ جب یہ احساس کسی بندے پر طاری ہو جائے تو وہ کوئی غلط کام نہیں کرسکتا دوسرے اُس سے کوئی نیکی قضا نہیں ہوتی۔

اِس کے بعد محک الفقر کلاں میں حضرت سلطان صاحبؒ نے فقیر اور درویش کی چھ خصلتیں گنوائی ہیں: ”چھ حروف سے“ چنانچہ

الف سے اللہ بس
حرف ب سے بابرکت تمام
حرف ت سے ترک
حرف ث سے ثابت قدم
حرف ج سے جاہل نہ ہو اور
حرف ح سے حلاوت نہ دے نفس کو۔ (ص ۱۴۵)

حضرت سلطان العارفین سلطان باہوؒ نے فقر کی ایجابی وسلبی اقدار کے متعلق ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے۔ محبت الاسرار میں تو گویا خلاصہ بیان کردیا ہے:

”واضح رہے کہ فقیری میں پانچ حسب ذیل چیزیں ترک کرنی چاہئیں:
جہل۔ دنیا۔ اہل دنیا۔ نفس۔ ریا
......فقیر پر پانچ حسب ذیل مؤکل ہونے چاہئیں:

۱- توکل علی اللہ
۲- شریعت نبوی ﷺ

۳- المفلس فی امان اللہ
۴- مرشد عارف باللہ
۵- پیشوائے کلام اللہ سے محبت“ (ص ۳۶)

اور فرمایا:

”اگر دنیا میں علمائے عالم اور فقرائے کامل نہ ہوتے تو لڑکے لہو ولعب کھیل کود میں اور جوان کبر و غرور و مستی میں اور بوڑھے غیبت اور چغلخوری میں مبتلا رہتے‘ چاہیے کہ زیادہ گوئی اور خصوصاً بدگوئی سے اور مستی اور خواہش نفسانی سے بچے اور خاموش رہے۔“

کیونکہ

”فقیر باہو کہتا ہے:
جوہر علم زبان پر ہوتا ہے اور
جو ہر فقیر سینہ میں رہتا ہے“ (عین الفقر ص ۱۹۱-۱۹۲)

فقہ (دین کی سمجھ بوجھ)

”پس اے طالب! اب میں تجھ کو بتلاتا ہوں‘ فقہ کے تین حرف ہیں تاکہ تجھ کو معلوم ہووے کہ تین حرفوں سے کیا مراد ہے یعنی ف ق ھ

پس

حرف ف کے حرف سے فضیحت مراد ہے۔
اور ق سے قباحت
اور ھ سے ہوائے نفس پرور مراد ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ علم فقہ کا سیکھنا اور اس پر عمل کرنا ہر ایک مسلمان پر فرض عین ہے۔“ (محک الفقر کلاں ص ۱۱۴)

یہاں دین کی سمجھ (فقہ) کے بغیر جو خرابیاں بندے کے ظاہر و باطن میں

پیدا ہوتی ہیں' ان کا ذکر کر دیا ہے تا کہ فقہ کی اہمیت معلوم ہو جائے۔

دین کی سمجھ کے بغیر بندہ کہیں بھی عمل پیرا ہوگا تو چونکہ اسے اچھے اور برے کی تمیز نہ ہوگی۔ اور درست و نادرست کی پہچان نہ ہوگی۔ اس لیے رسوائی ہوگی۔

دین کی سمجھ بوجھ کے بغیر کئی ذہنی و عملی قباحتیں پیدا ہوں گی جن کا نتیجہ دین و دنیا کی بربادی پر منتج ہوگا۔

فقہ کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر صحیح ڈسپلن پیدا نہیں ہوتا یعنی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں رک جائے اور کہاں آگے بڑھنے کی اجازت ہے۔

ق

قلب

قلب عام طور پر دل کو کہتے ہیں مگر دل کیا اور کہاں ہے؟ عام طور پر سینہ کے اندر گوشت پوست کے لوتھڑے کے اندر پنہاں ایک قوت کو دل کہا جاتا ہے۔ انسان کے مرکز یا مرکزی نظام کو بھی قلب یا دل کہا جاتا ہے۔ اسے اسی دل کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے جو خون کو جسم کے اندر اوپر نیچے صاف کر کے رواں رکھتا ہے۔ اسی خون کی روانی پر زندگی اور موت کا انحصار ہے۔

سلطان العارفینؒ بھی ذات کے مرکز کو قلب کہتے ہیں۔ اسے سمجھنا گویا خود کو سمجھنا ہے۔ خود آگاہی قلب کی معرفت سے شروع ہوتی ہے:

"قلب کا عارف ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ قلب میں پروردگار کے بہت سے اسرار ہیں۔ نفس کو پہچاننا ہی قلب کے مراتب ہیں۔"

(فضل اللقاء ص ۴۰)

فرمایا:

"قلب ایک نہایت وسیع ولایت اور ملک عظیم ہے۔ دونوں جہان معہ مخلوقات اس میں سما سکتے ہیں۔ لیکن دل دونوں جہان میں نہیں سما سکتا۔ اور قلب اللہ تعالیٰ کی نظر نگاہ میں ہے۔" (ایضاً)

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے قلب کے کمالات بیان کر کے قلب کی حقیقت سمجھائی ہے:

"قلب کے تین حرف ہیں۔ ق ل اور ب
ق سے مراد قرب الٰہی
ل سے مراد لقاء الٰہی
ب سے مراد بقاء باللہ
جو شخص ان صفات سے متصف ہے' وہ صاحب قلب ہے۔"

(قرب دیدار ص ۴)

نفسیاتی سطح پر جب درویش اپنا تزکیہ کرلیتا ہے تو اُس کی ذہنی کیفیت اسے اُس کے مرکز کے قریب کر دیتی ہے۔ یہ مرکز ذکر عبادت اور ریاضت کے ذریعہ جلاء پاتا ہے۔

جوں جوں ذکر وفکر اور عبادات میں آگے بڑھتا ہے' اللہ کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ نفسانی خواہشات مرجاتی ہیں۔ (فنافی اللہ) تو الٰہی اخلاق اُس کی جگہ لے لیتے ہیں اور یوں وہ بقا پانے والی قوتوں کے ساتھ زندہ رہتا ہے (بقاء باللہ) اب اُس کا رخ ہمیشہ کے لیے اللہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ قلب کی روشنی کمال پر پہنچتی ہے تو اُس پر تجلیات کا نزول ہونے لگتا ہے۔ (لقاء الٰہی)

ک

کبر

"کبر تین حرف ہیں ک ب ر
حرف ک سے کرامت دور ہوتی ہے اور
حرف ب سے برکت
حرف ر سے رحمت" (محک الفقر کلاں ص ۲۳۰)

چونکہ یہ ایک منفی صفت ہے اس لیے اِس کے بداثرات کی طرف اشارہ کر کے اِس کی تخریب کاری کا ذکر فرمایا ہے۔

کرامت سے دُوری

صوفیاء کی اصطلاح میں کرامت کی دو قسمیں ہیں کرامت فی اللہ جو اللہ اور بندے کے درمیان تعلق سے متعلق ہے۔ "اس کا علم کسی غیر کو نہیں ہوسکتا۔" اور کرامت فی الخلق' اس کے ذریعے دلوں میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات خرق عادات کا بھی اظہار ہوتا رہتا ہے۔ موخرالذکر "ارشاد اور طلب حق کے امور میں مفید نہیں۔" (۲۴)

جب انسان کے دل میں کبر پیدا ہوتا ہے اور یہ درویشی اور فقیری میں کسی سطح پر بھی دل میں آسکتا ہے تو یہ کرامت خواہ اللہ اور بندے کے درمیان تعلق پر مبنی ہو یا مرشد اور طالبین حق کے درمیان واسطہ کے طور پر ہو' جاتی رہتی ہے۔

لیکن کبر کے معنی سمجھ لینے چاہئیں۔ کبر سے مراد اپنی بڑائی کے متعلق دعویٰ

حق نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اُس بڑائی کا احساس ہے جو اوّل تو درویش میں ہوتی نہیں اور اگر ہوتی ہے تو وہ اس پر اتراتے ہوئے دوسروں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔

برکت سے دوری

برکت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ نیکیوں میں اضافہ مال و اولاد میں کثرت، درجات کی ترقی، نیک صحبت کا اثر کسی مرشد کی روحانی توجہ اور قوت قدسیہ سب کو برکت کہتے ہیں۔ متکبر آدمی اِن سب سے محروم ہو جاتا ہے۔

رحمت سے دوری

کبریا تکبر اللہ کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جھوٹ موٹ کی بڑائی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے تو اُس کے اپنے دل سے بھی رحمت دور ہو جاتی ہے جو دل کی رقت اور نیکی کے عمل سے متعلق ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ کبر مزاج آدمی شقی القلب ہو جاتا ہے۔

کبریائی صرف اللہ کے لیے ہے۔ اور بندے کے لیے صرف بندگی ہے۔

کامل

"کامل میں تین حرف ہیں:

ک سے کامل تصرف اس میں ہے کہ جتنا خرچ کرے کہ نہ ہو
م سے مراد یہ ہے کہ مردہ دل کو نگاہ ہی سے زندہ کر دے۔
اور حضوری الٰہی میں پہنچا کر دیدار الٰہی سے مشرف کر دے۔
ل سے مراد یہ ہے کہ طالب کو لقاء الٰہی بخش کر لایحتاج بنا دے۔"

(امیر الکونین ص ۹۷)

اس تعریف سے ظاہر ہے کہ حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ تکمیل کے انتہائی درجے پر فقیر کو کامل کہتے ہیں۔ یہ ایک لحاظ سے مرشد کا مقام

ہے جو خود بھی نور ہے اور نور بخش بھی ہے۔

کامل تصرف

خرچ کرنے سے مراد مال و دولت کا خرچ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد علم و معرفت کا "انفاق" ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے کہ اس کے بانٹنے سے بانٹنے والے کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ وہ اتنا بڑا عارف ہے کہ اُس کی معرفت کی انتہا نہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اُسے کوئی ایسا طالب نہیں ملتا جو انتہائی درجے کی معرفت پانے کا اہل ہو۔ صاحب تصرف کامل کا خود یہ حال ہوتا ہے کہ وہ ہر مقام اور حال کے مطابق تصرف کی قدرت رکھتا ہے جیسا کہ رسالہ روحی میں فرمایا:

"عارف کامل قادری بہر قدرتے قادر و بہر مقام حاضر۔"

دل کی زندگی اور روشنی

فقیر کامل کی توجہ میں بلا کی تاثیر ہوتی ہے۔ اُس کی مجلس اور صحبت میں بیٹھنے والے لوگ نیکی کی جانب مائل ہو جاتے ہیں اور ان کے دل کو نئی زندگی ملتی ہے۔

تیری نظر سے تجھ کو خبر ہے کہ کیا ہوا
دل زندگی سے بار دگر آشنا ہوا

اگر وہ اُس کو مرشد مان لیں تو وہ انہیں حضوری میں بھی پہنچا سکتا ہے یعنی وہ اُس کی رہبری میں ایسے مقامات پر پہنچ جاتے ہیں جہاں خدا کو حاضر ناظر مانتے، جانتے اور پہچانتے ہیں۔

لایحتاج

جب حضوری کی کیفیت نصیب ہو جائے (لقاء الٰہی) تو پھر درویش کو کسی چیز کی حاجت نہیں رہتی۔ وہ رضا کے ایسے مقام پر متمکن ہوتا ہے جہاں اللہ کے اور

اُس کے فیصلے ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ اللہ کا اور اللہ اُس کا ہو جاتا ہے۔

من غنی ام بادشاہ ہم باخدا
بادشاہ در نظر من مفلس گدا
احتیاج نیست مارا سیم و زر
غالبم با موسیٰ ؑ غالب با خضر ؑ

(امیر الکونین ص ۱۰۴)

(میں خدا کے ساتھ ہوں، غنی ہوں اور بادشاہ،
بادشاہ میری نظر میں مفلس گدا ہے۔
ہمیں سونے چاندی کی ضرورت نہیں۔
میں موسیٰ اور خضر کے ساتھ غالب قوت رکھتا ہوں)

ل

لذت

لذت ایک بڑا جامع لفظ ہے جس میں مسرت، سرور، لطف اور ذائقہ سب کے معنی پائے جاتے ہیں۔ لذت میں مسرت سے زیادہ کشش ہے۔ اس میں ایک نشے کی سی کیفیت ہے جو پورے وجود میں جاری و ساری ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسے شیرے کی طرح گاڑھی ہے جس میں مکھی کے پر اور پاؤں پھنس کے رہ جاتے ہیں۔ کسی بھی بندے کے لیے لذت سے زیادہ مغلوب کرنے والی اور کوئی حرص نہیں۔ بلکہ یہ تو حرص اور ہوا و ہوس کی محرک جبلت ہے۔

فقیر اگر کسی لذت میں اسیر ہو جائے تو اُس کے مقصد کی تکمیل میں اس سے بڑی اور کوئی روکاوٹ نہیں۔

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے مشاہدے میں اِن چار لذتوں کو برتری حاصل ہے:

۱- لذت طعام ۲- لذت مجامعت
۳- لذت حکومت بادشاہی ۴- لذت مطالعہ

غور سے دیکھا جائے تو یہ چاروں انسانوں کی بنیادی ضروریات ہیں۔ یعنی غذا، جنس، سیاست، علم۔ لیکن جب اِن میں جذباتی لگاؤ کی بنا پر شدت پیدا ہوتی ہے تو انسان ان لذات میں ایسا کھو جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ہو، اُس کے سوا اُسے اور کوئی ہوش نہیں رہتا۔

سلطان صاحبؒ ہدایت فرماتے ہیں کہ اگر آدمی اپنے روحانی کردار کی تشکیل چاہتا ہے تو ان چاروں لذتوں کو بھول جائے اور ایک پانچویں لذت ہے۔ اُس میں جیسے چاہے' افراط اختیار کرے اور وہ ہے لذتِ انوارِ پروردگار یعنی راہ فقر میں روحانی تجربات و مشاہدایت کا ذوق وشوق' مذکورہ بالا چار لذتوں کا توڑ بھی اسی لذت میں ہے۔ ''چوں لذت پنجم تصور اسم اللہ ذات در وجود در آید' ایں چہار لذت خوش نیاید'' (جب پانچویں لذت تصور اسم اللہ ذات میں باطن میں آتی ہے تو پھر یہ چاروں لذتیں اچھی نہیں لگتیں) (نورالہدیٰ فارسی ص ۹۰)

اِن چاروں لذتوں میں آخری دو میں جب آدمی غلو اختیار کرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ اچھی بات ہے۔ مثلاً سیاست وحکومت میں دراصل قوت و اقتدار مقصود ہوتے ہیں مگر انہیں خدمت کا نام دیتا ہے یا مطالعہ کتب میں غرق رہتا ہے تو اسے ذوقِ علم کہتا ہے اور کتب بینی کے بعد کسی کام کا نہیں رہتا بلکہ بعض اوقات نتیجہ اُس کے حق میں ضرر رساں ظاہر ہوتا ہے۔ اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَر۔ مگر ایک عارف ان کی حقیقت کو جان لیتا ہے۔ ''واضح رہے کہ عارف باللہ صاحب کل کو لذت بھی ذاتِ کل سے ہے...... جس وجود میں معرفت الٰہی کی لذت ہوتی ہے۔ اس سے چاروں لذتیں نکل جاتی ہیں۔ بعد ازاں معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی لذت ایسی لذت ہے جس سے روح کو راحت حاصل ہوتی ہے۔'' (اسرار قادری ص ۶۰)

لذتِ ذات میں بڑی کشش ہے مگر یہ فقیروں کے حلقے میں آنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ''جب نور ذات لازوال کے دیدار اور وصال کی لذت عارف حق کے وجود میں آتی ہے تو پھر اسے دنیا' عاقبت' حور وقصور اور بہشت کی تمام نعمتیں مطلق زہر تلخ معلوم ہوتی ہیں...... ذات کی لذت نفسانی عقل وشعور کی لذت سے بیزار کر دیتی ہے......

به ز ہر لذت بود لذت لقا
لذتِ فانی چہ باشد بے بقا

به ز ہر لذت بود رو مصطفیٰ
لذتِ دنیا چہ باشد بے وفا

(لقائے الٰہی کی لذت ہر لذت سے بڑھ کر ہے
لذت فانی کیا ہوگی جو ناپائیدار اور بے بقا ہے۔
ہر لذت سے بہتر روئے مصطفےٰ کا دیدار ہے
لذت دنیا کیا ہے؟ بے وفا اور عارضی) (فصل اللقاء ترجمہ کے بی نسیم ص ۱۱۲)

روحانی واردات و تجلیات کی لذت مرشد کی زیر نگرانی ذکر و فکر اور مراقبات اور ریاضات سے حاصل ہوتی ہے اور جب یہ محسوس ہونے لگے تو پھر اُس کے مقابلے میں سب لذتیں ہیچ ہیں۔

لائق اِرشاد

اگر آپ اپنے گرد و پیش میں نظر ڈالیں تو بے شمار نام نہاد مرشد آپ کو نظر آئیں گے بعض کو محض ورثہ میں گدی ملی اور بعض کو پیری مریدی کا ڈھنگ آ گیا تو لوگوں کو مرید کرنا شروع کردیا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے دیکھا کہ ہم تقریریں بھی کر لیتے ہیں۔ قرآن بھی خوش الحانی سے پڑھ لیتے ہیں اور نعتیہ کلام بھی ترنم سے سنا سکتے ہیں۔ وہ بھی پیر ہو گئے۔ یہ سب مرشد کے کوائف سے بے خبر ہوتے ہیں۔ سلطان باہو فرماتے ہیں:

''کامل اور لائق ارشاد وہ فقیر ہے کہ بطور آزمائش چار آدمیوں کو ارشاد و تلقین کرے۔

اوّل بادشاہ ظل اللہ کو
دوسرے عالم ولی اللہ کو
تیسرے شیخ بے باطن کو
چوتھے جاہل کو علم کی قید میں لائے۔'' (اسرار قادری ص ۳۱)

ایک تو وہ اُنہیں ذکر و مراقبہ سکھاتا ہے خاص طور پر تصور اسم اللہ ذات

اور دوسرے وہ انہیں مجلس محمدی ﷺ میں لے جاتا ہے: ''ان دونوں مرتبوں پر ذکر و فکر کھلتے ہیں۔ قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے، ذات و صفات کے مقامات منکشف ہوتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۳۲)

مرشد کامل ہونا چاہیے۔ حضرت سلطان العارفین سلطان باہوؒ کی نظر میں ناقص اور ادھورا مرشد کسی کام کا نہیں ہوتا۔

م

محبت

''محبت کے چار حروف ہیں:

حرف م سے اسم مسمّٰی میں محو و فنا فی اللہ ہونا

ح سے اپنے وجود سے حرص کو نکالنا

ب سے بخل نہ رکھنا

ت سے فقر کو تمام کرنا مراد ہے۔

جس میں چاروں علامتیں نہیں، وہ پریشان ہے۔'' (جامع الاسرار ص ۶۷)

محبت ایک عالمگیر جذبہ ہے اور اس قدر عام کہ تمام زبانوں کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی جذبہ کی عکاسی و ترجمانی پر مشتمل ہے۔ صوفیاء کرامؒ اعلیٰ سطح پر محبت صرف اس ذات پاک کے ساتھ مانتے ہیں۔ جو خالق، مالک ہونے کے ساتھ جمیل وجلیل بھی ہے۔

محو و فنا فی اللہ

کسی سطح کی محبت ہو، عام تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ محبت کرنے والا ہر وقت محبوب کی یاد میں محو رہتا ہے اور اپنی ذات اور اُس کی ضروریات کو بھول کر

محبوب کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے، وہ یہی چاہتا ہے کہ ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں لیے ہوئے۔'' صوفیوں، فقیروں اور درویشوں کی محبت تو ذات حق سے ہوتی ہے۔ اور جس قدر ذات حق کی کشش ہے۔ اسی طرح یہ محبت بھی شدید ہوتی ہے۔ اس سے اس کی محویت اور عاشق کی فنائیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ:

ہستی من رفت و خیالش نماند
اینکہ تو بینی نہ منم بلکہ اوست

(خسروؒ)

(میری ہستی چلی گئی اور اُس کا خیال بھی نہ رہا یہ جو تو دیکھتا ہے، میں نہیں ہوں بلکہ وہی ہے)

دفع حرص

جہاں محبت ہو، وہاں حرص و ہوا کا دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ محبت تو سب کچھ دینے کے لیے ہے، لینے کے لیے نہیں۔ اس کے برعکس حرص و ہوا میں کچھ لینا ہوتا ہے، دینے کی تو وہاں کوئی بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا محبت میں حرص کو دفع کیا جاتا ہے۔ اور دینے کے لیے ہاتھ اور دل کھلے رکھنے پڑتے ہیں۔

دفع بخل

جب ہاتھ اور دل کھول دیئے جاتے ہیں تو بخل خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ محبت اگر سچی ہو تو پھر بخل کی وہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہاں مال و دولت تو کیا، اگر جان بھی دینی پڑ جائے تو محبت کرنے والا دریغ نہیں کرتا۔

تکمیل فقر:

ذاتِ حق سے محبت ہو تو پھر تکمیل ذات کے سارے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ محبت کی تعریف ہی یہ ہے کہ محبت وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتی ہے۔ اس

میں استقلال، تواتر اور تسلسل ہوتا ہے۔ یوں محبت کرنے والا ہر حالت میں آگے بڑھتا جاتا ہے اور کسی مقام پر نہیں رکتا۔ یہاں تک کہ ذات حق کی طرف سے جو معشوق ہے، اقرار ہوتا ہے: ''تو عاشق مائی'' (تو ہمارا عاشق ہے) اس کے باوجود عاشق کو یہ احساس رہتا ہے کہ وہ عشق کی ذمہ داریوں سے کماحقہ عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

بہرصورت فقر کی منزل تمام ہوتی ہے تو محبت کرنے والا لقاء الٰہی کے دیدار سے مشرف ہوتا ہے۔

محمد ﷺ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَهْلِ بَیْتِهٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ عَلَیْهِ۔ سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبٍّ الرَّحِیْمِ

حضرت سلطان العارفینؒ نے اسم محمد (ﷺ) کے حروف سے ان ثمرات کی طرف اشارات کی نشاندہی کی ہے جو اسم محمد کے ذکر، تصور اور مراقبے کے بعد طالب حق کو حاصل ہوتے ہیں۔ اسم محمد (ﷺ) کا ذکر کلمے کے ساتھ اور اس کا تصور دعوت کے دوران کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مشق مرقوم وجودیہ کلمے کے ساتھ کی جاتی ہے۔ (دیکھئے رسالہ اسرار ھو از راقم)

فرمایا: ''حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے م سے معرفت الٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

حرف ح سے مجلس محمدی ﷺ کی حضوری نصیب ہوتی ہے۔

دوسرے م سے دونوں جہان کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔

اور د سے تمام مقاصد رونما ہوتے ہیں۔

چاروں حروف ننگی تلوار کافروں اور یہودیوں کے قتل کے لیے یہ ہے:

محمد ﷺ!'' (اسرار قادری ص ۱۶)

یہ اشارات ایسے متن کے ہیں جو تصور سے متعلق ہے۔

معرفت الٰہی کا مشاہدہ

جب طالب حق اپنے عملی سلوک میں اسم محمد کا تصور کرتا ہے تو پھر اسے بہت سی وارداتِ روحانی کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ باتیں جو اُس نے علمی طور پر سنی تھیں۔ اب وہ ان کو ہو بہو بذریعہ کشف والہام اپنے سامنے پاتا ہے۔ اس طور پر اس کا ایمان حق الیقین کے مرتبے تک پہنچ جاتا ہے۔

مجلس محمدی ﷺ کی حضوری

تصور اسم اللہ ذات میں جب مشق پختہ ہو جاتی ہے تو پھر حضرت سلطان العارفین حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ مجلس محمدی ﷺ کے مراقبے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اس میں مرشد کی حاضری میں رہنمائی ضروری ہے۔ اگر مرشد کامل ہو تو وہ طالب حق کو حضور نبی کریم ﷺ کی مجلس میں پہنچا دیتا ہے۔ جہاں طالب صاحب مراقبہ خلفائے اربعہؓ صحابہ کبارؓ اور اہل بیت رضوان اللہ اجمعین کی زیارت سے شرف یاب ہوتا ہے۔

دونوں جہان کا نظارہ

اسم محمد ﷺ کے تصور و تفکر اور مراقبہ میں طالب حق دیکھتا ہے کہ وحدت کا جب کثرت کی جانب ظہور ہوا تو اُس نے نور محمد ﷺ کی صورت اختیار کی اور آگے اُس سے دونوں جہان پیدا ہوئے۔ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قصیدۂ غوثیہ میں فرمایا:

نَظَرْتُ اِلٰی بِلَادِ اللّٰہِ جَمْعاً

کَخَرْدَلَةٍ عَلٰی حُکْمِ اتِّصَالٖ

(میں نے اللہ تعالیٰ کے تمام ممالک کی طرف دیکھا تو وہ سب ملے جلے مجھے ایک رائی کے دانے کے برابر معلوم ہوئے)

تمام مقاصد کی رونمائی

اسم محمد ﷺ کے تصور، تفکر اور مراقبے کے ساتھ فقیر پر وہ سارے مقاصد آشکار ہو جاتے ہیں جن کی خاطر اسے پیدا کیا گیا اور شریعت، معرفت اور محبت کی رو سے جن مقاصد کی تکمیل اسے سونپی جاتی ہے۔ ان کے بارے میں اللہ اور اُس کے رسول اور مرشد کے ذریعے واضح ہدایات مل جاتی ہیں۔ پھر قدرت کے مقاصد کی نگہبانی اُس کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔

"عقل بیدار" میں بھی حضرت سلطان العارفینؒ نے اسم محمد ﷺ کا ایک نقش برائے تصور عطا فرمایا ہے جس کے گرد لکھا ہے: فیض البرکات، جمعیت باجمال، وصال لازوال اور گنج الفضل۔ اور پھر فرمایا:

"واضح رہے کہ اسم محمد ﷺ میں چار حرف ہیں یعنی
م، ح، م، د پس
حرف م کے تصور سے مجلس محمدی ﷺ اور
حرف ح سے تصور حضوری حضرت محمد ﷺ اور
م اور د سے حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کا
ہم نفس، دم بدم اور سر سے باسخن ہو جاتا ہے۔" (ص ۷۴)

مجلس محمدی اور حضوریٔ حضرت محمد ﷺ کے تصور و مراقبہ کے بارے میں پہلے لکھا جاچکا ہے۔

حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کا ہم نفس اور دم بدم

یہ اشارہ ہے حضور ﷺ کی اتباع کاملہ کی طرف۔ ہمارے اولیاء اللہ نے حضور کے اسوۂ حسنہ کے مطابق اپنے اعمال کو ڈھال کر درجات پائے۔ بلکہ کوئی بھی آپ کی امت سے کسی مرتبے کا مالک ہوا تو وہ آپ کی وساطت سے:

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی غور
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

مگر کامل نمونہ اتباع کا صرف فقرائے امت محمدیہ ﷺ میں نظر آتا ہے۔

حضرت غوث الاعظمؒ نے اپنے قصیدہ میں فرمایا:

وَکُلُّ وَلِیٍّ لَهُ قَدَمٌ وَّاِنِّیْ
عَلٰی قَدَمِ النَّبِیِّ بَدْرِ الْکَمَالِ

(ہر ولی کا قدم کسی نبی کے قدم پر ہوا کرتا ہے، پر میرا قدم جد پاک محمد مصطفےٰ ﷺ کے قدم پر ہے)

اورنگ شاہی میں عالم باللہ کی تعریف میں فرمایا (یاد رہے کہ سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ عالم باللہ اور فقیر کامل کو ایک جانتے ہیں):

"عالم باللہ وہ ہے جو محمد کے حرف
م سے معرفت الٰہی کے مشاہدے کا تصور کرائے اور
ح سے آنحضرت ﷺ کی حضوری دکھلائے اور دوسرے
م سے مغفور ہووے اور
د سے ہمیشہ باشریعت ہووے۔" (ص ۳۰)

یہاں مرشد عالم باللہ کے حوالے سے بات ہو رہی ہے کہ مرشد طالب حق کو اپنی اُن واردات میں شریک کرے جن سے معرفت کے بارے میں حق الیقین حاصل ہوتا ہے اور مجلس محمدی ﷺ کے مراقبے میں رہنمائی کرے کہ طالب حق کو حضور ﷺ کی حضوری نصیب ہو۔

مغفور ہونے سے مراد یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک رحمت الٰہی میں ڈھانپا جائے۔ اور ہر حال میں باشریعت رہے کیونکہ حضرت سلطان العارفینؒ کے سلوک فقر میں شریعت سے باہر ہر حکم مردود اور باطل ہے۔

مراقبہ

مراقبہ کے معنی ہوتے ہیں ''نگرانی''۔ صوفیاء کی اصطلاح میں مراقبہ کی ایک خاص صورت ہے جس میں ذکر اور فکر دونوں شامل ہوتے ہیں وہ دو زانو یا مربع شکل میں بیٹھ جاتے ہیں اور دل کو سارے وساوس' تفکرات اور خیالات سے پاک کرکے کسی ایک اسم' آیت یا کلمہ کا دل میں ورد جاری رکھتے ہیں۔ حضرت سلطان العارفین سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ کے طریق فقر میں کئی قسم کے مراقبات ہیں جیسے مراقبہ تصور اسم اللہ ذات' مشق مرقوم وجودیہ' مراقبہ مجلس محمدی وغیرہ۔ بہر صورت مراقبہ خواہ کسی قسم کا ہو' اس کے آداب اور شرائط ایک ہیں۔ جسم اور کپڑوں کی پاکیزگی' وضو اور مراقبہ۔

''واضح رہے کہ مراقبہ میں چار چیزیں ہیں جو چار م ہیں۔

پہلا م مراقبہ سے محبت ہے یعنی مراقبہ محبت سے اسرار پروردگار مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ اسم اللہ ذات کے تصور سے ہوتا ہے۔

دوسرا م مراقبہ سے معرفت توحید نور الٰہی حاصل ہوئی۔ یہ بھی اسم اللہ ذات کے تصور سے ہوتا ہے۔

تیسرا م معراج الصلوٰۃ دل سے کھلتا ہے۔ ذکر جاری ہوتا ہے۔ ذوق اور فرحت نصیب ہوتے ہیں اور تمام وجود کے ہر رونگٹے سے یا اللہ کی آواز نکلتی ہے۔ یہ مراقبہ لہٗ کے تصور سے ہوتا ہے۔

چوتھا م مراقبہ سے مجموعہ الوجود یعنی سر سے پاؤں تک تمام مشاہدہ انوار میں مستغرق ہوتا ہے۔ اگر یہ باتیں نہیں تو سمجھ نفس و شیطان' غالب و قادر ہیں۔''

(کلید التوحید کلاں ص ۱۹۲-۱۹۳)

محبت

مراقبہ میں جب درویش اسم اللہ ذات پر اپنی ساری باطنی قوتیں مرکوز کر دیتا ہے جسے تصور کہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے ذات حق سے محبت پیدا ہو جاتی

ہے۔ اور اسی محبت سے ''اسرار پروردگار کا مشاہدہ ہوتا ہے۔'' یعنی ان تمام مابعدالطبعیاتی حقائق کو وہ خود دیکھ لیتا ہے جو اُس نے پہلے صرف پڑھے یا سنے تھے۔ محبت کی اپنی واردات وتجلیات ہوتی ہیں۔ ان سے بھی رب کی ربوبیت کے کئی بھید کھلتے ہیں اور صاحب مراقبہ ان سے آگاہ ہوتا ہے۔

معرفت توحید نورِ الٰہی

یہ جو ''اسرار پروردگار کا مشاہدہ'' ہوتا ہے اسی سے معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کی توحید کے بارے میں حق الیقین ملتا ہے۔ یہ مراقبہ میں ''فوز عظیم'' ہے۔

معراج الصلوٰۃ

حدیث میں فرمایا گیا: نماز مومنوں کے لیے معراج ہے'' لیکن یہ وہ نماز ہے جو خشوع وخضوع اور پورے آداب کے ساتھ پڑھی جائے۔ اس طرح پڑھی جائے گویا بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے' خدا بندے کو دیکھ رہا ہے۔ ایسی نماز بجائے خود ایک موثر ترین مراقبہ ہے۔ لیکن سلطان العارفینؒ فرما رہے ہیں کہ جس طرح نماز مومنوں کے لیے معراج ہے' اسی طرح اسم لہٗ کا جب مراقبہ کیا جاتا ہے تو ویسے ہی مثبت نتائج پیدا ہوتے ہیں یعنی روحانیت کی ایک خاص سطح تک عروج حاصل ہوتا ہے۔ یہاں پورا وجود اللہ اللہ پکار اٹھتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے اللہ کا ذکر جاری رہتا ہے۔

مجموعہ الوجود

ذکر میں جس طرح ذکر کی کیفیت کے غلبہ کو سلطان الاذکار کہتے ہیں' مراقبہ کی ایسی ہی غالب کیفیت کو سلطان العارفین سلطان باھورحمۃ اللہ علیہ مجموعہ الوجود فرما رہے ہیں اور ساتھ ہی اس کے اثرات کی بھی نشاندہی فرما رہے ہیں کہ صاحب مراقبہ ''سر سے پاؤں تک تمام مشاہدہ انوار میں مستغرق ہوتا ہے۔'' لیکن

ایسا مراقبہ صرف منتہی فقیر کے نصیب میں ہوتا ہے۔

مراقبہ کے لیے استقلال بہت ضروری ہے یعنی صاحب مراقبہ ہر حال میں مراقبہ کی مشق جاری رکھے حتیٰ کہ اسے نبیوں اور ولیوں کی روحانی صحبت حاصل ہو جائے۔ ''صاحب مراقبہ ہفت اندام جب تک مجلس اولیاءؒ و انبیاءؑ سے ملاقات نہیں کرلیتا' مراقبہ سے سر نہیں اُٹھاتا۔'' (ایضاً ص ۱۹۳)

منتہی فقیر پر جو اسم ھو (ھویت' وحدت) کا تصور کرتے ہیں' چار اذکار کھلتے ہیں: ''اسم ھو سے چار منتہی ذکر کھلتے ہیں جنہیں محض حضور غرق نور کہتے ہیں۔ اوّل ذکر حامل یہ کسی مرشد کامل سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا ذکر سلطانی اس کا ذاکر ہوائے نفسانی کو ترک کرتا ہے اور لاہوت مکانی میں پہنچ جاتا ہے۔ چوتھا ذکر خفی جس سے ہمیشہ مجلس نبوی ﷺ کی حضوری حاصل ہوتی ہے۔ جس شخص کو اس قسم کا ذکر حاصل نہیں اُس کا مراقبہ مردود ہے۔'' یعنی جو شخص مراقبے کے ذریعہ اس حال و مقام کو نہیں پہنچتا۔ وہ اہل دنیا میں سے ہے اور ''سیاہ دل اہل دنیا کو کبھی قرب الٰہی حاصل نہیں ہوتا۔'' (ایضاً ص ۱۹۳)

مرشد

تصوف و فقر میں کسی پیر استاد کا ہونا اشد ضروری ہے حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے مرشد کی اہمیت کے بارے میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اگر اُن کی کتب سے متعلقہ اقتباسات جمع کئے جائیں تو بیسیوں صفحات کی ایک الگ کتاب مرتب ہو جائے۔

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضرت سلطان العارفینؒ نے جو فرمایا ہے۔

ناں کر منت خواج خضر دی تیرے اندر آب حیاتی ہو

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مرشد کی کوئی ضرورت نہیں' سب کچھ اپنے اندر ہے لہٰذا کسی کے ہاں جانا کبھی لازم نہیں۔ حالانکہ اس کا مطلب صرف اس قدر ہے

کہ استعداد تمہارے اندر موجود ہے اور اگر طلب بھی ہے تو مرشد خود تمہیں مل جائے گا اور کامیابی بھی ملے گی کیونکہ کرنا تمہیں خود ہی ہے' کوئی خواجہ خضر اور کوئی مرشد تمہارے کرنے کا کام تمہاری جگہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے کسی قسم کی منت سے کام نہ چلے جائے گا۔ کام کی استعداد تمہارے اندر ہے' کام تمہیں خود سرانجام دینا پڑے گا۔

اسی طرح سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میری قبر پر آؤ یا میری کتابیں پڑھو تمہارے لیے یہ زندہ مرشد کا کام دیں گی۔ آپؒ نے جو کچھ فرمایا' برحق ہے' مگر چونکہ آپ نے شرائط کا ذکر نہیں فرمایا' اس سے بھی کچھ لوگوں کو مغالطہ ہوتا ہے کہ شاید کسی سکھانے والے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

یاد رہے کہ کسی متوفی بزرگ کی قبر سے فیض کشید کرنے کی پہلی اور بنیادی شرط شدتِ شوق ہے اور شوق اُترتا چڑھتا رہتا ہے' کبھی زیادہ' کبھی کم۔ حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہو یا کسی اور بزرگ کا' اُس سے ہدایت کی تجلی کی ایک ہی صورت ہے کہ شوقِ فراواں میں وہ جذب ہو کر رہ جائے۔ اب وہ آدمی جو صرف اسی طریق سے رہبری کا خواہاں ہے خود اپنا جائزہ لے کہ وہ کس حد تک شوقِ طلب میں مجذوب ہو رہا ہے۔ دوسری خامی کسی طالب حق میں یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے سلطان صاحب کے مزار مبارک سے رہبری کا خواہاں ہوتا ہے اور کسی پیر استاد کا احسان نہیں لینا چاہتا' اب یہ اپنی جگہ ایک کبر خفی ہے' ہوسکتا ہے' سلطان صاحب اس کو کسی مرشد کے حوالے کرنا چاہتے ہوں اور وہ اڑا رہے کہ نہیں' میں تو یہیں بیٹھ کر سب کچھ لے لوں گا۔ حالانکہ یہ مقام ضد اور خود پسندی کا نہیں۔ عجز و انکسار اور بے خودی کا ہے۔ ان کے سوا یہاں کام نہیں بنتا۔

یہی حال کتب کا ہے۔ پڑھنا آپ کا کام ہے اور سمجھنا بھی۔ اب سمجھائے گا کون؟ درست ہے کہ سلطان صاحب نے یہ کام بھی اپنے ذمہ لیا ہے مگر اس کے لیے ذریعہ کیا منتخب کیا جائے گا؟ اگر طالب حق خود ہی سمجھنے کا کام اپنے ذمہ لے لیتا ہے تو پھر اسے وجدان کی اُس سطح پر پہنچنا پڑے گا جہاں وہ حضرت

سلطان باہو رحمۃ الہ علیہ سے ہم کلام ہوسکے ورنہ سلطان العارفینؒ سمجھانے کی جو صورت سامنے لائیں گے، وہ قبول کرنی پڑے گی۔ یہاں پھر اپنی مرضی سے کام نہیں چل سکتا۔ سلطان العارفین کے مدرسہ فکر و فقر میں داخلے سے پہلے اپنے اندر بہت کچھ قابلیت پیدا کرنی پڑے گی۔ یہاں بھی داخلہ میرٹ پر ملتا ہے۔ تصوف کی ابتدائی کتب پڑھے بغیر سلطان صاحب کی تعلیمات کو سمجھنا مشکل ہے۔ کوئی میٹرک پاس طالب علم ایم۔ اے کے نصاب کی کتب نہیں سمجھ سکتا۔ ہاں اگر بی اے ہو تب شاید کسی استاد کے بغیر کچھ باتیں سمجھ لے تو یہ ممکن ہے۔

بہرصورت فقر میں کوئی مرشد یا کوئی نہ کوئی پیر استاد اشد ضروری ہے۔ ورنہ ٹامک ٹوئیوں کے بغیر کچھ نہ ملے گا۔

مرشد کیا دیتا ہے اور کیسا ہونا چاہیے؟ سلطان صاحب اس کے بارے میں ہرطرح سمجھانے کی کوشش فرماتے ہیں:

طالب کی شرائط کے بعد مرشد کے کوائف کا ذکر فرماتے ہیں ''لفظ مرشد کے بھی چار حرف ہیں:

حرف م سے مراد یہ ہے کہ وہ اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰةُ الْمُؤْمِنُ (مومن مومن کا آئینہ ہے) کا مصداق ہو، موحد اور اسرار رب العلمین کا محرم ہو، مشفق ہو، مہربان ہو، ہر ایک ولی اللہ کی مجلس پہنچانے والا ہو اور جمعیت جاودانی بخشنے والا ہو۔

حرف ر سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی طرف راغب نہ ہو۔ اور نہ عقبٰی کی طرف توجہ کرے بلکہ راضی بقضائے رب ہو۔

حرف ش سے مراد یہ ہے کہ وہ لامکانی نور قدرت اور اسرار سبحانی کا شہباز ہو۔

حرف د سے مراد یہ ہے کہ اُس کا دل توحید فی اللہ کے دریا میں غرق رہے اور ہمیشہ جناب سرور کائنات ﷺ کی مجلس اقدس کی حضوری اُسے حاصل ہو۔''

(قرب دیدار ص ۸-۹)

موحد، محرم اسرارِ رب العالمین، مشفق، مہربان

موحد سے مراد یہ ہے کہ توحید کی شرح جانتا ہو، متقدمین صوفیاء اس صوفی کو موحد کہتے تھے جو توحید کو وحدت الوجود کی روشنی میں مانتا ہو، ممکن ہے حضرت سلطان العارفینؒ کی بھی موحد سے یہی مراد ہو کیونکہ وہ خود توحید کی شرح شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کی نظریہ وحدت الوجود کی مطابقت میں بیان فرماتے ہیں۔ (رسالہ روحی شریف)

محرم اسرار رب العالمین کا مطلب یہ ہے کہ روحانیت کے سارے احوال و مقامات اُس کی نظر میں ہوں۔ ان اسرار کو بھی جانتا ہو جو دوسروں کے ذریعہ منکشف ہوئے اور خود بھی اسرار کا مورد و کاشف ہو۔

فقر کی راہ میں طالبوں سے غیر ضروری ریاضت و مشقت کا تقاضا نہ کرے بلکہ اپنی ہمت اور توجہ سے آگے لے جائے۔ مرشد ایسا ہونا چاہیے کہ ہر حال میں مریدوں اور طالبوں پر شفقت فرمائے۔ اور ان کی ایسی تربیت کرے کہ وہ نفس مطمئنہ (جمعیت جاودانی) کو پالیں، اُس کی مہربانی کا یہ عالم ہو کہ وہ خود جس روحانی مقام سے گذرے، مرید کو اپنے ساتھ رکھے، جس ولی اللہ کی مجلس اُس پر کشف ہو، اس کے فیض سے اپنے مرید کو بھی محروم نہ رہنے دے۔

راضی بقضائے رب

مرشد ہونے کا حق صرف اُس ولی کو حاصل ہے جو دنیا و آخرت کی طرف رغبت نہ رکھے بلکہ محض رب کی رضا سے اُسے غرض رکھے۔ ''قادر دے ہتھ ڈور اساڈی جیوں رکھے تیوں رہیئے ہو'' جب تک پیر کے اندر کسی قدر کا پاس نہ ہو، تو مرید کے اندر بھی اُس کا احساس نہیں ہوسکتا۔ جب تک پیر تسلیم و رضا کے مقام پر نہ ہو۔ مرید کے اندر بھی اس کا حال پیدا نہیں ہوسکتا۔

شہباز لامکانی

مرشد وہ ہے جس کی روحانی پرواز زمان و مکان کی پابند نہ رہی ہو۔ قادر کی طرف سے اُسے نورِ قدرت حاصل ہو کہ وہ تسخیر و تصرف کر سکے اور الٰہی بھیدوں کو جانتا ہو کہ کب تصرف کرے اور کب باز رہے۔ یہ تسلیم و رضا کا ہی ایک حال ہے۔

حضوریٔ مجلس محمدی ﷺ

جہاں حضرت سلطان باہوؒ نے مجلس محمدی ﷺ کے مراقبے کی ہدایات لکھی ہیں۔ وہاں فرمایا ہے کہ تصور اسم ذات کے بعد مجلس میں داخلے کی اجازت ملتی ہے۔ تصور اسم اللہ ذات کے ذریعے ہی توحید فی اللہ حاصل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی مجلس محمدی کی طرف دروازہ کھلتا ہے۔ جو فقیر یہ سلوک طے کر چکا ہو۔ وہی مرشد ہونے کے لائق ہے۔

پھر فرمایا:

"مرشد میں م مروت کی ہے
ر ریاضت کی اور
ش شوق کی اور
د درد کی ہے۔" (عین الفقر ص ۵۸)

مروّت

مروّت کے معنی مہذب رویہ' فیاضی اور انسان دوستی کے ہیں۔ مرشد کی طبیعت میں سنجیدگی تو ہو لیکن خشکی اور یبوست نہیں ہونی چاہیے۔ چونکہ کام رشد و ہدایت کا ہے' اس لیے مرشد کا برتاؤ اگر مہذبانہ نہ ہوگا تو لوگ اُس کے پاس آنے سے کترائیں گے۔ جہانوں کے مرشد محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرمایا گیا۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ

(اللہ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں اور اگر آپ درشت طبع اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے)

ایک بہت بڑے نقشبندی مرشد کے خلیفہ کسی جگہ قاضی تھے۔ قضا کا عہدہ کچھ بے لحاظی کا متقاضی ہوتا ہے تو وہ بھی لوگوں کے ساتھ کچھ بے التفاتی کا سلوک کرتے ہوں گے۔ مرشد نے لکھا کہ جو بھی تمہارے ہاں سے آتا ہے۔ کوئی نہ کوئی شکایت ضرور کرتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ اس طرح مت پیش آیا کرو کیونکہ اس سے رشد و ہدایت کے کام پر منفی اثر پڑتا ہے۔

ریاضت

کام کے مطابق ہر منتہی فقیر کے لیے حکم الگ ہوتا ہے۔ جب کام سونپا جاتا ہے تو کئی درویشوں اور فقیروں کو ریاضت کم کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ البتہ وہ جو رُشد و ہدایت کے لیے چنے جاتے ہیں۔ عام طور پر ریاضت میں کمی نہیں آنے دیتے۔ چونکہ وہ دوسروں کو ریاضت کی تلقین کر رہے ہوتے ہیں اور خود اپنے تئیں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں' اس لیے ریاضات' جاری رکھتے ہیں۔ وہ خود ان تمام ریاضات میں گذر کر آئے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان پر وہ ریاضتیں شاق نہیں گذرتیں۔

شوق

طالب کے لیے شوق اور ہے۔ اس کے اندر یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو وصال و لقا کے لیے اسے بے قرار رکھتا ہے۔ مرشد کے اندر شوق طالبین حق کی رہبری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا پھر ذوق و اشتیاق کی کیفیات کے ساتھ برقرار رہتا ہے۔

درد

دردِ عشق کی ایک کیفیت ہے: "جو عشق کہ حضرت انسان کو عطا فرمایا گیا

ہے' اُس میں درد ہے تڑپ ہے' سوز ہے۔" طالب کے اندر درد "فراقِ محبوب" اور "آرزوئے وصال" کی وجہ سے ہے۔ اور مرشد میں درد مزید ترقی کے لیے ہے کیونکہ "موجب ترقی درد ہے۔" حضرت عطارؒ کا مشہور شعر ہے:

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرۂ دردت دل عطار را

(کفر کافر کو اور دیں دیندار کو دے دیا جائے۔
عطارؒ کے دل کو تو آپ کے درد کا ایک ذرہ ہی کافی ہے)

کلید التوحید کلاں میں فرمایا:

"واضح ہے کہ لفظ مرشد کے چار حرف م' ر' ش اور د ہیں۔

حرف م سے یہ مراد ہے کہ وہ مردہ کو زندہ کرے اور پھر اُس زندہ دل سے ایک ہی مراقبہ میں الا اللہ کی وحدانیت اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مجلس میں پہنچا دے۔

حرف ر سے یہ مراد ہے کہ وہ ریاضتوں سے رہائی دلا کر راز بخشے۔

حرف ش سے یہ مراد ہے کہ وہ طالب کے وجود سے نفس و شیطان' حلق' دنیا' سیاہیٔ دل کے شر بلکہ ہر ایک قسم کا شر نکال دے اور اس کے ساتوں اعضاء' ہڈیاں' مغز' گوشت پوست' رگ و ریشہ اور ہر ایک بال سے اسم اللہ جاری کرائے اور طالب کے قلب و قالب سے ذکر الٰہی دریا کی طرح جاری کردے۔ چنانچہ اس کے تمام اعضاء اللہ اللہ کرنے لگیں اور طالب لب بند کئے ہوئے اللہ تعالیٰ میں محو ہو۔

حرف د سے مراد یہ ہے کہ طالب کو ایک ہی نگاہ سے غرق فنافی اللہ میں ثابت قدم بنادے جس سے اُسے دونوں جہان کی زندگی حاصل ہو جائے۔

جس مرشد میں یہ صفات پائی جائیں وہ جامع جمعیت بخش اور رہبر ہوتا ہے اور جس مرشد میں یہ صفات موجود نہ ہوں' وہ طالبوں کے حق میں شیطان اور راہزن ہے۔" (ص ۹۲)

"عارف زندہ دل و روشن ضمیر سازم"

رسالہ روحی شریف میں مندرجات کے بارے میں فرمایا کہ اگر سلسلہ سلوک کا طالب انہیں غور سے پڑھے اور انہیں ازبر کرے تو صرف ایسا کرنے سے اُسے "میں زندہ دل اور روشن ضمیر عارف بنادوں گا۔"

سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ ہر مرشد سے ایسی توقع رکھتے ہیں کہ کوئی مردہ طالب آئے تو اس کے دل کو زندگی بخشے۔ تصور اسم ذات اللہ کے مراقبہ سے اُس کا اس قدر معاون ہو کہ مراقبے کے دوران اور اس کے بعد اُسے ہر طرف اللہ ہی اللہ نظر آئے۔ آگے ترقی دلائے تو مراقبہ کے ذریعہ مجلس محمدی ﷺ میں پہنچا دے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے طالب خود مرشد بن کے نکلتا ہے۔

راز بخش

تمام ریاضتوں سے مقصود وصال حق اور لقائے الٰہی ہے اور ان کا نتیجہ اللہ کے ساتھ راز و نیاز اور معرفت ہے۔ ریاضتوں سے رہائی دلانے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ریاضتیں کراتا ہی نہیں ہے۔ وہ ریاضتوں کا ثمر سامنے کر دیتا ہے۔ ریاضتوں کا یہ ثمر راز ہے۔ طالب دانائے راز اور بینائے راز سے بڑھ کر "صاحب راز" ہو جاتا ہے۔

ذکر میں محویت

جب تک تزکیہ نہ ہو۔ دل میں ذکر رواں نہیں ہوتا۔ جب آدمی کا دل اور جسم پاک ہو جاتے ہیں تو "قلب و قالب" پر ذکر کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ پورا وجود اللہ اللہ کہنے لگتا ہے۔ اسے سلطان الاذکار کہتے ہیں۔ یہاں کچھ ضبط کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انتہائی درجہ یہ ہے کہ آدمی بظاہر خاموش ہو لیکن اُس کا دل ذکر میں محو ہو: دست درکار' دل با یار۔

غرق فنا فی اللہ میں ثابت قدمی

جو طالب حق مرشد کے بغیر سلوک فقر طے کرنا چاہتا ہے۔ اوّل تو وہ گمراہ ہو جائے گا اور اگر وہ جادۂ حق پر قائم بھی رہے تو اُس کی واردات عارضی روشنیوں کی طرح آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ اس کے حال میں دوام نہیں ہوتا اور وہ کسی مقام پر زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے مرشد کی توجہ اور ہمت طالب حق کو اس کے مشاہدے میں ثابت قدمی عطا کرتی ہے۔ اسی لیے سلطان صاحب کا اپنے ایک بیت میں فرماتے ہیں:

جاگ بنا دُدھ جمدے نہ باہو لال ہوون بھانویں کڑھ کے ہو

(باہو! خمیر کے بغیر دودھ نہیں جمتا

خواہ وہ اُبل اُبل کر

سرخ کیوں نہ ہو جائے)

"خمیر" (جاگ) سے مراد یہاں مرشد کی توجہ ہے جسے وہ طالب کے شامل حال کرتا ہے تو اُس کی واردات میں استقلال پیدا ہوتا ہے۔ اور فنا فی اللہ کی کیفیت کو ثبات نصیب ہوتا ہے۔ تب بقا باللہ میں وہ دوام پاتا ہے۔

محک الفقر کلاں میں فرمایا:

حرف م سے میدانِ ازل و ابد کا مرد اور پہلوان

خاک اور نفس اور شیطان کو دفع کرتا ہے۔ معرفت میں محو عارف باللہ ہوتا ہے۔

حرف ر سے راز بخش رب العالمین

حرف ش سے وصل حق کا شاہد حال

حرف د سے دوام غرق بحق (ہمیشہ غرق بہ حق رہتا ہے)"

ایک تو مرشد خود محو عارف باللہ ہوتا ہے جس کی تعریف سلطان صاحبؒ نے رسالہ روحی میں یوں فرمائی ہے۔ "عارف و اصل جہاں کہیں آنکھ کھولیتا ہے

اُس کے دیدار کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا اور غیریت اور خود پرستی کا نقش مٹا دیتا ہے تا کہ مطلق کے ساتھ مطلق ہو جائے" (رسالہ روحی) اور دوسرے یہ کہ وہ طالب حق کا تزکیہ بھی کرتا ہے۔ خاک سے اٹھا کر ملکی صفات اپنانے میں مدد دیتا ہے۔ نیز نفس اور شیطان کے چنگل سے نجات دلاتا ہے۔

رب العلمین کے رازِ ربوبیت کی نہ صرف خبر دیتا ہے بلکہ اس کی معرفت اسے بخشتا ہے۔

اوّل تو خود اسے وصل حق حاصل ہوتا ہے دوم اپنے مرید کے وصل حق کا بھی وہ ضامن اور شاہد ہوتا ہے۔

خود بھی استغراق میں رہتا ہے اور دوسرے کو بھی اس کی استعداد کے مطابق "غرق بحق" رکھتا ہے۔

محک الفقراء میں فرمایا:

"واضح رہے کہ مرشد کے چار حرف ہیں جس سے معرفت حاصل ہوتی ہے۔

م سے ہمیشہ معراج

ر سے یہ مراد ہے کہ طالب مدعی سے دنیا کی زینت' نفسانی خواہش اور شیطانی خطرات دور کرے۔

ش سے یہ مراد ہے کہ شریعت میں ثابت قدم ہو اور اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی سے اسے شرم آئے۔

د سے یہ مراد ہے کہ ہمیشہ اپنا منہ بند رکھے اور عوام کی صحبت کو چھوڑ کر غرق فی التوحید رہے۔ (ص ۷)

مرشد کو روحانیت میں معراج حاصل ہے اور طالب کے لیے وہ وسیلہ معراج بھی ہے۔ وہ طالب کے دل سے دنیا کی خواہش نکال دیتا ہے اور اس کا تزکیہ کرتا ہے۔ شریعت پر کاربند رہ کر مریدوں کے لیے نمونہ بنتا ہے اور کبھی اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف نہیں چلتا۔

آخری بات بہت اہم ہے کہ اسے استغراق کا مقام حاصل ہوتا ہے جو منتہی فقیر کو ملتا ہے اور اگرچہ مرشد کی حیثیت سے اس کا براہ راست تعلق عوام سے ہوتا ہے مگر وہ صرف رشد و ہدایت کی حد تک ان سے غرض رکھتا ہے ورنہ ان سے الگ تھلگ خاموش زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے۔

امیرالکونین میں مرشد کے کوائف بیان فرمائے ہیں جو دراصل فقیر کامل کی خصوصیات ہیں:

"مرشد کے چار حروف ہیں۔

م سے مشاہدۂ حضور' معرفت اور معراج

ر سے رازِ حق' غرق فی التوحید نور

ش سے شہسوار عارف بروحانیت اہل قبور

د سے دوام بخش الہام۔" (ص ۹۴)

یہ چاروں خصوصیات مرشد کے کوائف بھی ہیں اور اس کے کام کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

نہ صرف مرشد خود مشاہدہ کے مقام پر ہوتا ہے وہ دوسروں کی بھی روحانی تربیت ایسے کرتا ہے کہ وہ بھی مشاہدہ کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح روحانی عروج پا چکا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی ان بلندیوں تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔

یہی حال رازِ حق کی یافت کا ہے۔ مرشد الٰہی رازوں کو جو پیدائش کائنات سے لے کر روزمرہ قانون قدرت کی عملی کارفرمائیوں تک پھیلے ہیں' نہ صرف جانتا اور دیکھتا ہے بلکہ دوسروں کو جاننے اور دیکھنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اسی طرح خود بھی باشعور استغراق کے عالم میں رہتا ہے اور دوسروں کو بھی توحید نور میں محو رکھتا ہے۔

عامل دعوتِ اہل قبور

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے عملی سلوک فقر میں

یہ ایک خاص عمل ہے جس پر انہوں نے بہت زور دیا ہے نیز اس کے طریقے اور اس کے فضائل بیان فرمائے ہیں۔ (دیکھیے "اسرار ھوٌ" از راقم) سروری قادری درویش یا فقیر اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے باترتیب دعوت پڑھتے ہیں یعنی کسی غالب ولی اللہ کی قبر پر نیت کر کے قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ اس طرح متوفی بزرگ کی روحانیت بیدار ہو جاتی ہے اور دعوت پڑھنے والے کو اس کی نیت کے مطابق اس کے کام میں مدد دیتی ہے۔ یا دعوت پڑھنے والا دیکھتا ہے کہ متوفی بزرگ نے اللہ اور رسول ﷺ کے حضور میں اس کے کام کی سفارش کردی ہے۔ مرشد کو "روحانیت اہل قبور" کا شہسوار ہونا چاہیے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی حاجت برآری کے لیے دعوت کا وسیلہ اختیار کر سکے۔ اسے ایک منتہی فقیر کامل کی طرح دعوت پڑھنے کا اہل ہونا چاہیے۔

آخری بات یہ ہے کہ مرشد نور بخش ہوتا ہے۔ وہ طالب کو ایک ایسا نور عطا کرتا ہے کہ الہام اور کشف کے راستے کھل جاتے ہیں اور اسے خود اوپر سے اور اپنے اندر سے ہدایات ملنے لگتی ہیں۔ بلکہ اس مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ میں اوپر اور اندر کا امتیاز بھی اٹھ جاتا ہے۔ جو کچھ آتا ہے حق کی طرف سے آتا ہے۔ اور ایک مخلص طالب حق کو جانتا ہے۔ حق دیکھتا ہے اور حق کہتا ہے۔

آخر میں عین الفقر کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

م سے مراد مردانِ خدا از خود جدا اور ملازم مجلس محمد مصطفےٰ ﷺ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور محبت جمیع انبیاء و اصفیاء"

ر سے مراد روگردانی از ماسوااللہ

ش سے مراد شوق قلب با عشق و محبت

د سے مراد دائمی غرق حضور فنافی اللہ" (ص ۱۱۲)

مرشد مردانِ خدا میں سے ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے خلق خدا کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں۔ اسے مجلس محمدی ﷺ کی حاضری و حضوری نصیب ہوتی ہے۔ اور چونکہ وہ انبیاء کرام اور اصفیا عظام محبت رکھتا ہے۔ اسی لیے ان کی اتباع

میں عمل کرتا ہے اور رشد و ہدایت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

ماسوائے اللہ سے الگ تھلگ رہتا ہے

عاشق ہوتا ہے اور شوق رکھتا ہے

اور ہر وقت بذریعہ ذکر و فکر اور تصور و مراقبہ حضوری کی کیفیت میں رہتا ہے۔

مسلمان

عام طور پر جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اور ارکان اسلام ادا کرتا ہے' مسلمان کہلاتا ہے ایک حدیث کی رو سے جو شخص بھی اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہے اور قبلہ رخ نماز ادا کرتا ہے۔ مسلمان ہے مگر سلطان العارفینؒ چونکہ روح سازی اور معرفت کے معلم ہیں اس لیے وہ مسلمان کو عقیدہ و عمل میں راسخ دیکھنا چاہتے ہیں۔ درویش اور فقیر کے لیے پہلے ''مسلمان'' ہونا لازم ہے۔ فرمایا:

''واضح رہے کہ جو شخص ابھی مومن مسلمان کے مرتبے کو نہیں پہنچا۔ وہ فقر فی اللہ' عارف باللہ اور درویش حسبۃ للہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

لفظ مسلمان میں چھ حرف ہیں: م س ل م ا ن

م سے مسلمان رحمان کے موافق' شیطان کے مخالف۔ علم کے موافق' جہالت کے مخالف۔ روح کے موافق۔ نفس کے مخالف۔ شریعت کے موافق بدعت کے مخالف ہوتا ہے۔

س سے سلیم قلب' تسلیم حق' رضا قضا اور نیک خلق ہو۔

ل سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہمیشہ زبان پر ہو۔

م سے نص' حدیث' مسائل فقہ' توحید اور تصوف کے علم سے متکلم ہو' اسے ارادۂ صادق صدیق باتصدیق ن سے نیک نیت مراد ہے۔

جو شخص ان صفات سے موصوف نہیں ہوتا' وہ حقیقی اور حق بردار' حق پر

جان نثار مسلمان نہیں ہوتا۔'' (کلید التوحید کلاں ص ۲۳۳)

موافق اور مخالف

مسلمان نیکی کے ساتھ موافقت اختیار کرتا ہے اور بدی کا مخالف ہوتا ہے۔ احکام الٰہی' علم' روحانیت اور شریعت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور نفسانی و شیطانی ترغیبات' جہالت اور بدعات کا مخالف ہوتا ہے۔

صاحب قلب سلیم اور نیک خلق

قلب سلیم کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا:

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ o اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (جس دن کہ مال اور اولاد کچھ کام نہ آئے گی لیکن فائدہ والا وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے سامنے بے عیب دل لے کر آئے گا۔ (۲۶-۸۹)

وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرٰھِیْمَ o اِذْ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ o (اور تابعداری کرنے والوں سے ہی ابراہیم بھی تھے۔ جبکہ اپنے رب کے پاس بے عیب دل لائے۔ (۳۷-۸۵) قلب سلیم کے معنی ترجمہ کرنے والوں نے دنیا کے مال و متاع کی محنت سے پاک دل یا جہالت کی تاریکیوں سے اور اخلاقی رذالتوں سے پاک دل مراد لیے ہیں۔ یعنی خالص من الشرک والشک' القلب السلیم عن مرض الکفر والنفاق' سلیماً عن الشرک وعن الشک وعن الغل والغش والحقد والحسد۔

سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قلب سلیم وہ ہے ''جس میں اللہ کے سوا کچھ نہ ہو۔'' (۲۵)

ایسا قلب سلیم رکھنے والا ہمیشہ راضی بقضا ہوگا اور نیک خلق ہوگا یعنی الٰہی اخلاق سے متصف۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ذاکر اور عامل۔

گفتگو اور ارادۂ صادق

ایک مسلمان جب بات کرے گا تو وہ قرآن و حدیث اور فقہ اور توحید اور

تصوف سے باہر نہ ہوگی۔ اس کا کلام اس کے اسلام کا مظہر ہوگا۔ اس کی نیت صاف ہوگی اور اس کا عمل اس کی تصدیق کرے گا۔

وہ ہر حال میں نیک نیت ہوگا۔ اگر ہر کام اس کی نیت کے مطابق عمل میں نہ بھی آئے تو وہ نیت کے ثواب کا مستحق ضرور رہے گا۔

مومن

"واضح رہے کہ مومن کے چار حرف ہیں:

م سے مومن نفاق کو چھوڑتا ہے، تصدیق قلبی، طلب مولیٰ اور محبت کو حاصل کرتا ہے۔ یہ معنی صاف دل، با ادب، باحیا مومن کے ہیں۔

و سے واحدانیت میں غرق، لاسوی اللہ سے مردہ دل اور صاحب توحید ترک توکل، تجرید، تفرید ہو جاتا ہے۔ اس کی روح بلحاظ اخلاص بایزیدؒ ہو جاتی ہے اور وہ نفس یزید کا دشمن ہو جاتا ہے۔ مومن معرفت کے سوا نہ کچھ اختیار کرتا ہے نہ خریدتا ہے۔

م سے مراد یہ ہے کہ موذی نفس کو حرص و ہوا کی لذت نہ دی جائے۔

ن سے نیت المؤمن خیر من عملہ (مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوا کرتی ہے) مومن کا پیشہ نیک بختی اور نیک عملوں کا کرنا ہے۔" (کلید التوحید کلاں ص ۲۲۲-۲۲۳)

مسلمان کا بلند تر مرتبہ "مومن" ہوتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ

(اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول ﷺ پر اتاری ہے۔ (۴-۱۳۶)

تاکید سے مراد ہے "کمال ایمان اور اس پر استقرار و اثبات کا حکم ہے" یعنی مومن کا مقام حاصل ہوگا جب اسلام کی ہر جزو پر عمل کیا جائے گا تاریخ اسلام میں اگر کوئی گروہ ایسا نظر آتا ہے جس نے ایمان کا کمال دکھایا اور شریعت کے ظاہر

و باطن کے مطابق عمل کیا تو وہ صوفیوں، فقیروں اور درویشوں کا گروہ ہے۔

بہ لحاظ اخلاص بایزیدؒ

یہاں بھی جتنی خصوصیات مومن کی بیان فرمائی ہیں وہ ایک ولی اور فقیر کی صفات ہیں اور حضرت بایزید بسطامیؒ کے حوالے سے تو صاف اشارہ فرمایا ہے کہ حضرت سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک "مومن" سے مراد ولی یا فقیر کامل ہے جو واحدانیت میں غرق ہوتا ہے۔ دنیا کی محبت سے الگ تھلگ (ترک، توکل تجرید و تفرید)۔ اور اس کی ساری توجہ اللہ کی پہچان (معرفت) اور اس کے احکام پر عمل میں بسر ہوتی ہے۔ اس کی اپنی پسند و ناپسند ختم ہو جاتی ہے۔ (مخالفت نفس)

مخالفت نفس

مومن کی لذت خواہی اور لطف اندوزی کا مطمح نظر وہ نہیں ہوتا جو عام انسانوں کا مقصود و مطلوب ہوتا ہے (آج کے دور میں جیسے مال و دولت اور سیاسی قوت) اس کی منزل بھی الگ ہوتی ہے اور معیار بھی الگ۔ اس کی لذت کا ذریعہ بھی کسی اصول کے مطابق کاربند رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہاں اصول ایک ہے: اللہ کے حکم کی اطاعت۔

نیک بخت اور نیک عمل: فرمایا مومن نیک بخت اور نیکوکار ہوتا ہے اور اس کے نیک عمل کا دارومدار اس کی نیک نیت پر ہوتا ہے بلکہ نیت اس کے عمل پر فوقیت رکھتی ہے۔ اگر اُس کا عمل نیت کے مطابق نہ بھی ہو تب بھی نیت کا اجر اسے ملے گا۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نیت نیک وہ ہوتی ہے جو دینی و روحانی اصولوں کی روشنی میں کی جائے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا میں تاکید پھر نیت کی ہے کہ پہلے اگر تم حالات کی موافقت کے پیش نظر مسلمان ہوئے تو اب دوبارہ سے نیت کرلو کہ تم نے اسلام کی ایک ایک جزو پر عمل کرنا ہے۔

طریقت میں بیعت کا مفہوم بھی یہی ہوتا ہے کہ دوبارہ سے ایک شیخ کے ساتھ عہد کیا جاتا ہے کہ اب طالب شریعت پر کاربند رہتے ہوئے اپنے شیخ کی نگرانی میں اپنا تزکیہ کرے گا اور اس کی ہر ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک مقام تک پہنچے گا جہاں اس کا وجود اپنے لیے نیک بخت اور دوسروں کے لیے فیض بخش بن جائے گا۔

معرفت

فرمایا:

''واضح رہے کہ شریعت طریقت کے متصل ہے
اور طریقت حقیقت کے
اور حقیقت معرفت سے
شریعت کے ش سے مراد شوق
طریقت کے ط سے مراد طاعت باطنی اور ذکر الٰہی
حقیقت کی ح سے مراد حرص کو دور کرنا اور
معرفت کے م سے محرمِ اسرار ہونا مراد ہے۔
جس شخص کو یہ چار حرف حاصل ہیں' اسے اہل حرف مجموعہ فقر اور اہل اللہ کہتے ہیں۔ دانا کو اشارہ ہی کافی ہے۔'' (جامع الاسرار ص ۲۶)

جہاں حقیقت سے مراد حرص دور کرنا مراد لیا ہے۔ وہاں حرص سے جدید نفسیات کی زبان میں کسی چیز سے Emotional یا Sentimental لگاؤ مراد ہے۔ چونکہ یہ جذباتی لگاؤ کسی اصول کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی طبیعت کے غلبے کی بناء پر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ حرص و ہوس ہے اور حرص و ہوس کی نگاہ جہاں پڑے گی۔ وہ حقیقت کو اس کی اصل صورت میں نہ دیکھ پائے گی۔ حقیقت کی مسخ صورت ہی اس کی نظر میں آئے گی۔ جب ہر شے کی صورت مسخ ہوگئی تو معرفت (حقیقت کی پہچان) بھی ناممکن ہوگئی۔

اگر حرص و ہوس یا جذباتیت کو ترک کر کے قدم آگے بڑھایا جائے تو پھر فقیری اور درویشی میں اسرارِ قدرت اور اسرارِ الٰہی ظاہر ہوتے ہیں۔ باطن میں ان کے کشف کا ذریعہ تجلیات و واردات ہوتی ہیں اور ظاہر میں ایک عارف زندگی کو خاص حکمت الٰہی کے تحت بنتا بگڑتا ہوا دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا اور ایسے ہی ہوسکتا تھا۔ وہ ان رازوں کو جانتا اور دیکھتا ہے' جن سے دوسرے بے خبر ہوتے ہیں۔

موت

فرمایا: ''باطنی موت کی سات قسمیں ہیں:
اوّل موت محبت
دوم موت معرفت
سوم موت مشرف مشاہدہ مولےٰ
چہارم موت موذی نفس کا قتل کرنا اور ہر دو جہان کا تماشہ پشت ناخن پر دیکھنا۔
پنجم موت مدام حضوری حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہونا۔
ششم موت ملاقات انبیاء و اولیاء اللہ
ہفتم موت محرم اسرار پردہ بردار سخت بیدار ہوتا ہے۔
(نور الہدیٰ ص ۱۰۷)

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کی وضاحت سے ظاہر ہے کہ یہاں موت کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ باطنی موت کا بیان ہو رہا ہے۔ جب طالب حق ایک مقام کو چھوڑ کر اگلے مقام میں منتقل ہوتا ہے تو گویا پہلے مقام پر اس پہ موت وارد گئی۔ اب وہ واپس اس مقام پر نہیں آئے گا خواہ وہ مقام اس کے لیے کیسا ہی دلفریب کیوں نہ رہا ہو کیونکہ اب اس کی ترقی ہوگئی ہے۔

آخری مقام منتہی فقیر کامل کے لیے مخصوص ہے۔ حضرت سلطان العارفین

خود اس مقام و مرتبہ پر فائز تھے۔ الہامی رسالہ روحی میں فرمایا:

"جان لے (اے طالب حق) کہ اس پاک کتاب کا مؤلف فقیر' نور مطلق' تمام پردوں' حجابوں اور حاجبوں کو ہٹا کر سراپا وحدت ہوگیا ہے۔ سبحان اللہ اس بندے کا جسم (بمصداق) معمولی پردہ کے ہے مگر وہ اس کے درمیان ہزاروں عجیب بھید اور نادر نکتے ظاہر فرما رہا ہے خود ناطق' خود ہی منطوق' خود کاتب خود ہی مکتوب' خود دال خود ہی مدلول' خود عاشق خود ہی معشوق۔"

"سخت بیدار" ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس حال میں وہ دوسروں سے کہیں زیادہ باشعور ہوتا ہے۔ بلکہ اسے وہ شعور حاصل ہوتا ہے جو ایک طرح سے الوہی شعور کا پرتو ہے اور حیات و کائنات کے اندر کوئی شے اس کے حیطۂ ادراک سے باہر نہیں۔

مولے

"پس اے طالب! اب میں تجھ کو مولے کے حروف کے معنی بتلاتا ہوں۔

یعنی مولے میں چار حروف ہیں: م و ل ی

پس مولے کا طالب وہ ہوسکتا ہے کہ جو چار چیزوں کو اختیار کرے یعنی

م سے موت کو اختیار کرے...... جس کسی نے اپنی زندگی میں موت کو اختیار کیا اور بار بار موت کو یاد کیا' وہ زندہ جاوید ہوا۔

و سے واحد میں فنافی اللہ ہو کر گوشہ خلوت اختیار کرے۔

ل سے دنیا پر لعنت کرتا ہے۔

ی سے یگانہ خدا سے ہوتا ہے۔" (محک الفقر کلاں ص ۱۴۰)

یہاں مولے کی ذات و صفات کی بجائے طالب مولے کے لیے ہدایات بیان فرمائی ہیں۔ طالب مولے مرنے سے پہلے مر جاتا ہے اور بار بار اپنی موت کو یاد کرتا ہے تاکہ اُس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہو۔

اللہ کو اتنا یاد کرتا ہے کہ فنا فی اللہ ہو جاتا ہے اور تنہائی میں ذکر اور مراقبے

میں مشغول رہتا ہے۔

دنیا کو ترک کرتا ہے اور اُس کی دلفریبیوں سے دور رہتا ہے۔

مطلق سے مل کر مطلق ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی تحریر سے حضرت سلطان العارفین رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ مولے کو تو تم کیا سمجھو گے۔ جس قدر قرآن و حدیث میں بتا دیا گیا' بس وہی کافی ہے۔ اب تم طالب مولے بنو۔ طالب مولے بننا بھی ایک بڑا مرتبہ ہے۔

ن

نفس

کلید التوحید کلاں میں بیان فرمایا:

"واضح رہے کہ نفس کے تین حروف ن ف س ہیں۔

ن سے بدنیت' نالائق' نان طلب' ایمان کش' ناقص اور ناپسند مراد ہے۔

ف سے فریب دینے والا' فتنہ پرداز' فضیحت کرنے والا' فساد برپا کرنے والا اور فاجر مراد ہے۔

س سے لوہے سے سخت' پتھر سے سخت' شیطان کے موافق اور رحمان کے مخالف مراد ہے۔

یہ حقیقت نفس امارہ کی ہے جو کافروں' منافقوں' ظالموں اور جھوٹے دنیا داروں کا نفس ہے۔ لیکن جو نفس مطمئنہ ہے۔ اس کے تین حصوں ن' ف اور س سے حسب ذیل مراد ہے:

ن سے دن رات نالہ کرنا یعنی دن رات خوف خدا سے رونا' نہی کو چھوڑنا' امر معروف پر عمل کرنا' حلال کی روٹی کھانا یا توفیق ہونا' شغل الٰہی میں مشغول ہونا'

ذکر، فکر، معرفت، مراقبہ، مشاہدہ اور نور میں مستغرق رہنا، جب نفس نورِ الٰہی کے سبب مطمئنہ ہو جاتا ہے تو ایسے نفس والا بخشا جاتا ہے۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ الرَّحِيْمِ

ف سے مراد کفر و اسلام میں فرق کرنے والا، قَوْلُهٗ تَعَالٰى وَكَذٰالِكَ مَوْلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاَنَّ الْكَافِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (وہ اس لیے کہ ایمان والوں کا کارساز اللہ ہے اور اس لیے کافروں کا کوئی کارساز نہیں) (۴۷-۱۱)

ف سے دیں کا فخر مراد ہے۔

ف سے حق الیقین کا مرتبہ مراد ہے۔ حق الیقین والے کی یہ پہچان ہے کہ وہ حق کی قید میں ہوتا ہے۔ باطل پر نگاہ نہیں کرتا الاسلام حق و الکفر باطل۔

س سے راستی راہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ میں مشغول رہنا ہے، ظاہر میں اُس کا سر سجدہ میں ہوتا ہے اور باطن میں فنافی اللہ اور معبود میں غرق ہوتا ہے۔ نفس مطمئنہ کی یہ خصلتیں انبیاء اولیاء اور فقراء کے نفس مطمئنہ میں ہوتی ہیں۔" (ص ۸۲-۸۳)

ویسے ان عبارات کا مطلب صاف ہے۔ البتہ نفس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ نفس ایک ہی ہوتا ہے۔ مگر اسے سنوارنے کے دوران اس کی حالتیں اس قدر بدل جاتی ہیں کہ اس کی شکل دوسری معلوم ہوتی ہے ابتدائی صورت میں انسانی نفس تخریب اور توڑ پھوڑ اور چھیننے جھپٹنے کی طرف مائل رہتا ہے۔ یہاں اس کی حالت جانوروں کی طرح ہوتی ہے۔ اسے نفس امارہ کہتے ہیں۔ جب کچھ اسے ضبط میں لاتے ہیں تو پھر یہ جس حالت سے گذرتا ہے۔ اسے نفس لوامہ کہتے ہیں کہ جب کبھی آدمی اپنے اندر برائی پاتا ہے یا کوئی برائی اُس سے سرزد ہوتی ہے تو اس کے باطن کی ایک حس اُسے برا بھلا کہتی ہے۔ بناؤ سنوار کی آخری حالت نفس مطمئنہ ہے۔ اس درجے پر شریعت پر کاربند، برے بھلے کی پہچان رکھنے والا، حق الیقین کا حامل اور فنافی اللہ، بقاء باللہ ہو جاتا ہے۔

یہ خصائل اسے اُس حلقے میں لے آتے ہیں جو دنیا کے بہترین انسانوں کا حلقہ ہے یعنی انبیاء و اولیاء و فقراء کا گروہ۔

رسالہ جامع الاسرار میں فرمایا:

"نفس کے تین حرف ہیں ن ف س

ن سے مراد یہ ہے کہ نیت نیک ہو

ف سے فتنہ چھوڑ دیا جائے

س سے سخت نفس کو تابع کرنا چاہیے

نیز ن سے نیت خاص

ف سے فنا یا روح بقاء

س سے سرتاج اولیاء، سرالاسرار باخدا۔" (ص ۷۷-۷۸)

یہاں بھی نفس امارہ سے نفس مطمئنہ کی طرف تزکیہ و تصفیہ کی کارروائی مراد ہے۔ اوپر کے دونوں کے اقتباسات میں نیت کو دوبار دہرایا ہے۔ اگر نفس امارہ کی قید سے نکلنا ہے تو نیت نیک اور خالص ہونی چاہیے۔

نفس کو ڈسپلن سکھایا جائے اُس کے لیے طریق وہی اطاعت احکام الٰہی ہے۔ پھر نہ فتنہ کی خواہش ہوگی نہ اوامر کی خلاف ورزی کی۔

نفس مطمئنہ کے درجہ پر کمال بقاء باللہ ہے۔ پھر ایسے ہی لوگوں میں سرتاج الاولیاء ہوتے ہیں جو اپنی جگہ الٰہی بھیدوں کو جاننے والے ہوتے ہیں۔

و

وصال

تصوف کی اصطلاح میں وصال کا مطلب ہے:

"تعین کا اٹھ جانا اور ہستی مجازی سے جدائی کا واقع ہو جانا اور اپنی خودی کے وہم سے بیگانہ ہو جانا وصالِ حق ہے۔ اسے آشنائی حق بھی کہتے ہیں۔

تو مباش اصلاً کمال ایں است و بس

تو ز تو گم شو وصال ایں است و بس

(تو خود نہ رہے یہی کمال ہے اور بس،

تو ''تجھ'' سے گم ہو جا' وصال یہی ہے اور بس)
واصل حق' حق ہے۔'' (۲۶)

آخری جملے سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ حسین بن منصور حلاج نے ''اناالحق'' کیوں کہا؟ کیونکہ وہ اپنے تئیں واصل حق سمجھتے تھے۔ ''چنانچہ واصل حق مخلوق نہیں رہتا اور مخلوق کے اثرات اُس پر سے زائل ہو جاتے ہیں۔'' (۲۷)

حضرت سلطان العارفین سلطان باھو رحمۃ الہ علیہ نے مرشد کی اہلیت و قابلیت کے ضمن میں وصال کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلے ذکر فرمایا کہ قادری مرشد ''تصور اسم اللہ ذات کی نظر سے اور یا کلمہ طیب کی ضرب سے یا اپنی باطنی توجہ کے ساتھ طالب مولٰی کو معرفت اللہ کے نور میں غرق کر کے مجلس محمدی ﷺ کی حضوری سے مشرف کر دیتا ہے۔'' پھر فرمایا: ''قادری تو ہمیشہ معرفت و وصال اور نور خداوندی میں غرق رہتا ہے۔''

یہاں وصال کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں: ''اور اس وصال کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وصال تو وہ ہے جو الہام کی تجلیات سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا وصال وہ ہے کہ جس سے طالب کلی طور پر تجلیات الٰہیہ میں غرق رہتا ہے۔''

پہلی قسم کا وصال ایک طرح سے قرب کا ایک مقام ہے جس کی نشانی مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ ہے یعنی کشف و الہام وغیرہ۔ دوسری قسم کا وصال ایک ایسا آخری مقام ہے جس کا کوئی اخیر نہیں کوئی انتہا نہیں۔ اسے حضرت سلطان العارفین ''استغراق'' کہتے ہیں جس میں اعلٰی روحانی شعور ساتھ رہتا ہے۔

وصال کی کوئی بھی صورت ہو' سلطان صاحب اناالحق کی بجائے ھوالحق کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔

نوٹ: صوفیوں کی اصطلاح ''و'' (اور) خدا اور مخلوق کے درمیان تعلق کی علامت بھی ہے۔ ترکی کے خطاط اسے اپنا پسندیدہ حرف سمجھتے ہیں اور اپنی پسند کو ایک حدیث سے منسوب کرتے ہیں: ''واوین پر بھروسہ کرو۔'' (۲۸)

✿......✿......✿

ھ

ھو

ھو مرتبہ ذات ہے: ''اعتبار ذات بلحاظ غیبت اور بلا اعتبار صفات'' (سر دلبراں) ھو حق ہے!

ھو لطیفہ سر کا ذکر ہے۔

ھو قرب کا ایک مقام ہے۔

ھو وحدت الوجود کی نشاندہی کرتا ہے۔

لَیْسَ فِی الدَّارَیْنِ اِلَّا ھُوَ

(دونوں جہان میں اُس کے سوا کوئی نہیں)

ھو اسم اعظم ہے۔

حضرت سلطان العارفین سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''چناں غرق گشتم بدریائے ھو
کہ ازل و ابد را خبر ہم ندارم

میں ھو کے سمندر میں ایسا ڈوبا کہ مجھے ازل و ابد کی خبر ہی نہیں۔''

ھو کے مقام کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس حضور میں عالم باللہ مست باشعور ہوتا ہے۔ خام کو بھی مستی ہو جاتی ہے۔ اور مست ہوشیار بن جاتا ہے۔ یہ مرتبہ وصال ہے۔ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ فنا کو بقا تک پہنچاتا ہے۔ لیکن بقا کو فنا نہیں کرتا اور آپ بیچ میں منصف ہو جاتا ہے۔'' (توفیق الہدایت ص ۱۰۱)

یہ مراتب تصور اللہ ذات کرنے اور مشق مرقوم وجودیہ کرنے سے حاصل

ہوتے ہیں۔ ''اس کی مشق دونوں جہان کے لیے بمنزلہ کنجی ہے۔'' اسے آپؒ نے علم حی قیوم کہا ہے۔ (اسرار قادری ص ۴۷)

مختلف کتابوں میں اس کے نقش برائے تصور و مشق مرقوم وجود یہ نقل کئے گئے ہیں۔

ھو کے ذکر سے حضرت سلطان العارفین شروع سے باھو (ھو کے ساتھ) تھے یعنی پیدائشی ولی ہونے کی بناء پر آپ کو ھو کا مقام قرب ازل سے ہی ودیعت کر دیا گیا تھا۔

دوسروں کو بھی ھو تک پہنچنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

ھو دا جامہ پہن کراہاں اسم کماوں ذاتی ھو
کفر اسلام مقام نہ منزل نہ اُتھے موت حیاتی ھو
نہ اوتھے مشرق مغرب' نہ اوتھے وینہ تے راتی ھو
اوہ اساں وچ اسیں اُنہاں وچ دور باھو قرباتی ھو

(آؤ' ھو کا جامہ پہن لیں
اور اسم اللہ ذات کے ذکر میں مشغول ہو جائیں۔
(وہاں پہنچیں) جہاں کفر و اسلام ہی ہے
نہ مقام و منزل اور نہ موت و حیات!
نہ وہاں مشرق نہ وہاں مغرب!
نہ وہاں دن نہ وہاں رات!
باھو!
قرب کا کیا ذکر
وہ ہم میں ہے
اور
ہم اُس میں ہیں!)

لا

کئی دوسرے صوفیاء کی طرح حضرت سلطان العارفین سلطان باھوؒ نے بھی لا کو ایک الگ حرف شمار کیا ہے حالانکہ درحقیقت یہ دو حروف ہیں' ل اور ا = لا

لا کلمہ طیبہ کا پہلا لفظ ہے۔ اگر یہ ل اور ا کو ملا کر لا لکھا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے عاشق و معشوق دونو بغلگیر ہو رہے ہیں۔ اور شکل سے یوں بھی لگتا ہے جیسے یہ دو دھاری تلوار ہے۔ یا اگر اسے لا لکھا جائے تو قینچی کی مانند ہے جیسے روز بہان باقلیؒ سے نقل کیا گیا ہے: ''میں نے لا کی قینچی سے گویائی کی زبان کو گونگا کر دیا۔'' (۲۹)

لا نفی کا کلمہ ہے۔ اسی نفی سے اثبات ہوتا ہے۔ دیوان باھوؒ کی پہلی غزل کے پہلے تین اشعار میں نفی اور اثبات کی تاکید ہے۔

یقین دانم دریں عالم کہ لا معبود اِلاّ ھو
ولا موجود فی الکونین' لا مقصود اِلاّ ھو
چوں تیغ لا بدست آری بیا تنہا چہ غم داری
مجو از غیر حق یاری کہ لا فتاح اِلاّ ھو
بلا لا لا ہمہ لا کن بگو اللہ و اللہ جو
نظر خود سوئے وحدت کن کہ لا مطلوب اِلاّ ھو

(مجھے یقین ہے کہ اس عالم میں لا معبود الا ھو!
دونوں جہان میں کوئی موجود نہیں اور کوئی مقصود نہیں الا ھو!
جب تو لا کی تلوار ہاتھ میں لے تو تنہا چلا آ تجھے کیا ڈر ہے؟
غیر حق سے مدد مت لے کیونکہ لا فتاح الا ھو!

لا لا لا سے سب کو لا کردے، اللہ بول اور اللہ ہی کو ڈھونڈ۔
وحدت کو دیکھ کر لا مطلوب اِلّاھو!)

فقر و درویشی کے عملی سلوک میں نفی اثبات (لا الہ الا اللہ) کا ذکر بھی بہت اہم ہے۔ مرشد کی تلقین ذکر اسی ذکر سے بار آور ثابت ہوتی ہے۔ ابیات باھوؒ کا پہلا بند ہے:

الف: اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ھو
نفی اثبات دا پانی ملیس ہر رگے ہرجائی ھو
اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلاں پر آئی ھو
جیوے مرشد کامل باھوؒ جیں ایہہ بوٹی لائی ھو

(الف۔
اسم اللہ ذات
چنبیلی کی بیل کی مانند ہے
جو مرشد نے میرے دل میں لگا دی
ہر رگ میں اور ہر جگہ پر اسے نفی اثبات کا پانی ملا۔
اب پھلنے پھولنے پر آئی تو
خوشبو ہر طرف پھیلنے لگی
باھو!
مرشد کامل سلامت رہے
جس نے
یہ بوٹی لگائی)
لا اِلٰہَ اِلاَّ اللہ
لا معبود الا اللہ
لا موجود الا اللہ
لا مقصود الا اللہ

✿......✿......✿

ء

اِستغراق

اصل میں ھمزہ (ء) اور الف (ا) ایک ہی حرف کی دو صورتیں ہیں اس لیے لغت کی کتب میں ھمزہ سے شروع ہونے والے الفاظ کا کوئی باب نہیں ہے مگر حرف کے طور پر حروف تہجی کی فہرست اسے ضرور الگ لکھا جاتا ہے۔

اسے اِستغراق

استغراق کے معنی ہیں مکمل طور پر غرق ہو جانا' کسی کام میں اس حد تک انہماک کہ اِدھر اُدھر کی سدھ بدھ نہ رہے۔

سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ کے عملی سلوک میں جب فقر و عشق کی منزل تمام ہوتی ہے تو پھر آگے ''ابحارِ استغراق'' (استغراق کے سمندر) ہیں۔ جن میں فقیر مستغرق ہو جاتا ہے۔ ذکر میں ہو تو پھر اُس کا وجود استغراق کی کیفیت میں سرتاپا ذکر ہو جاتا ہے۔ یا پھر اوپر سے اُسے جو کام دیا جاتا ہے تقریر و تحریر کا ہو یا خدمت خلق اور رشد و ہدایت کے کسی شعبے کا' فقیر بس اُسی کا ہو رہتا ہے۔

لیکن اُس کا شعور دونوں سطحوں پر ایک ہی طور پر کارفرما رہتا ہے اوپر وہ اللہ کے ساتھ ہے نیچے وہ دنیا میں ہے۔ اُس کے لیے مکان لامکان' ظاہر باطن اور اوّل و آخر ایک ہیں' کہیں دوئی یا فرق نہیں ہے۔ اب یہ استغراق اُس کے لیے ایک ایسی قوت ہے جو خود انرجی ہے' انرجی کا مصدر و منبع ہے اور اُس کا جاری ہونا'

پھیلنا اور سمٹنا سب اُس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک مالک الملکی فقیر کا استغراق ہے۔

فرمایا:

''اور فقر کی منزل میں بارگاہ کبریا سے حکم ہوا کہ
تو ہمارا عاشق ہے۔ اس فقیر نے عرض کیا کہ عاجز
کو حضرت کبریا کے عشق کی توفیق نہیں ہے۔
فرمایا: ''تو ہمارا معشوق ہے۔''
پھر یہ عاجز خاموش رہا۔ حضرت کبریا کی شعاع کے عکس نے بندہ کو ذرہ کی طرح استغراق کے سمندروں میں مستغرق کر دیا۔''

(رسالہ روحی شریف)
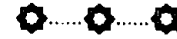
ی

یقین

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ بھی دوسرے صوفیاء کی طرح یقین کے تین درجے بیان فرماتے ہیں:

علم الیقین: دیکھ سن کر جان لینا کہ فلاں چیز واقع ہو سکتی ہے جیسے سنتے ہیں کہ لندن ایک شہر ہے۔

عین الیقین: کہیں لندن پہنچتے ہیں تو دور سے دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ وہ لندن شہر نظر آ رہا ہے۔

حق الیقین: یہ یقین کا آخری درجہ ہے جب کہ کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی یعنی جب لندن میں داخل ہو کر اس کے کوچہ و بازار میں پھرنے لگتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہی لندن ہے جس کے بارے میں سنتے اور دور سے دیکھتے آئے تھے۔

صوفیاء کرام دوسروں کو حق الیقین تک پہنچانے کے اہل ہوتے ہیں۔

فرمایا:

''واضح رہے کہ یقین کے چار حرف ہیں: ی ق ی ن
ی سے یگانہ حق بنا تا ہے۔
ق سے قرب حق حاصل ہوتا ہے۔

ی سے یکتائے حق بناتا ہے۔

ن سے نفس کو حرص و ہوا سے خالی کرتا ہے۔ (ص ۲۸۰)

یگانہ حق: دراصل یہ وہی عارف واصل کی خصوصیت ہے جسے ''روحی'' میں بیان فرمایا: ''عارف واصل جہاں کہیں آنکھ کھولتا ہے' اس کے دیدار کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا اور غیریت اور خود پرستی کا نقش مٹا دیتا ہے تاکہ مطلق کے ساتھ مطلق ہو جائے۔'' یہ آزادگی اور اختیار کا مقام ہے' جہاں بندۂ حق منفرد اور بے مثال ہو جاتا ہے۔ یکتائے حق سے بھی یہی مراد ہے۔

نفس کو حرص و ہوا سے پاک کرتا ہے تو حق کا مقرب ہو جاتا ہے۔ قربِ حق میں ہی اُسے وہ مقام ملتا ہے جسے ''یکتائے حق'' یا ''یگانہ حق'' کہا گیا ہے۔

یہ سب احوال و مقامات یقین کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں مگر یقین سے مراد یہاں یقین کا آخری درجہ حق الیقین ہے اور بندۂ حق کو حق الیقین حاصل ہوتا ہے جب وہ کاروبار حیات میں اور پوری کائنات کے نظام رحمت' ربوبیت اور قدرت کو دیکھ لیتا ہے یا جب اسے اس نظام الٰہی میں حکمت نظر آنے لگتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے۔ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً (اے ہمارے رب تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا۔ (۳-۱۹۱)

پھر سر جھکا کر اقرار کرتا ہے: فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَo وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَالْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُo (پس اللہ کی تعریف ہے جو آسمانوں اور زمین اور تمام جہان کا پالنہار ہے۔ تمام بزرگی اور بڑائی آسمانوں اور زمین میں اُسی کی ہے اور وہی غالب اور حکمت والا ہے۔'' (۴۵:۳۶-۳۷)

محک الفقر کلاں میں عالم باعمل کی تعریف میں فرمایا:

''پس ابتدائے علم الف سے ہے اور یا ب سے کہ تمام برکت اور عظمت کی انتہا ہے۔ اور انتہائے علم ی اور ی سے یگانہ ہونا مراد ہے کہ جو معرفت مولے کے ساتھ ہو۔ ان علماء کی شان اعلیٰ اور اولےٰ ہے۔'' (ص ۱۱۸)

دراصل عالم باعمل کا مرتبہ ایک منتہی فقیر کا مرتبہ ہے۔ ''جاننا چاہیے کہ عالم باعمل وہ ہے کہ اوّل سے آخر تک جو قید علم کے ساتھ ہو اور اس کا اس پر عمل ہو اور علم مناظرہ اور مطالعہ سے علیحدہ ہو۔''

فقیر کامل وہی ہوتا ہے جس میں علمی خودنمائی نہیں ہوتی۔ اُسے معرفت حاصل ہوتی ہے اور شان میں وہ دوسروں سے بڑھ کر اور سب سے آگے ہوتا ہے۔

❁.....❁.....❁

حوالے

تمہید

۱- یوحنا کی انجیل کے ابتدائی کلمات کی شرح کو جس طرح سے مسیحی حضرات پیش کرتے ہیں، اگر آپ نظر انداز کر کے اپنے رنگ میں پڑھ سکتے ہیں تو حقیقت اسی طرح ہے:
"ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔" (۱-۲)

۲- مولانا رومؒ دعا فرماتے ہیں

اے خدا تو بنمائی جاں را آں مقام
کہ اندر آں بے حرف می روید کلام

(اے خدا تو روح کو وہ مقام دکھلا دے جہاں کلام بے حرف نمو پاتا ہے)

۳- عقل بیدار از حضرت سلطان باہوؒ ص ۷۷ (اردو ترجمہ)

۴- محک الفقر کلاں ص ۱۵۷-۱۵۸

۵- Martin Lings: A Sufi-Saint of the twentieth century p.148-57.

۶- فقیر نور محمد مرحوم۔ مخزن الاسرار۔

۷- قاضی سجاد حسین۔ دیوان حافظ ص ۲۰

۸- رسالہ روحی شریف۔ ترجمہ و شرح از راقم

۹- اصطلاحات صوفیہ از خواجہ عبدالصمد چشتی

۱۰- Mustical Dimensions of Islam by Annemarie Schimmal p.421

۱۱- اسرار ھواز راقم

۱۲- ڈاکٹر شمل ص ۴۲۲

۱۳- الابریز ترجمہ پیر محمد حسن ص ۱۵۱

۱۴- محک الفقر کلاں ص ۱۵۸

۱۵- محک الفقر خورد ص ۲۵ تا ۲۹

۱۶- محک الفقر کلاں ص ۱۵۸

۱۷- اسرار قادری از حضرت سلطان باہوؒ ص ۳۲

✿.....✿.....✿

اِسرارالحروف

۱- عبدالصمد زمزمی۔ اسرار الحروف ص ۱۱

۲- شیخ عبدالکریم الجیلیؒ۔ الکہف والرقیم اردو ترجمہ وشرح شاہ وہاج الدین ص ۱۲۸

۳- ایضاً ص ۱۷۵

۴- راقم۔ شرح ابیات باہو ص ۸۷

۵- شاہ محمد ذوقیؒ۔ سر دلبراں ص ۱۲۸

۶- شیخ بدرالدین سرہندی۔ حضرات القدس ص ۸۲

۷- راقم۔ احوال و مقامات حضرت سلطان باہو ص ۱۲۰
نیز دیکھئے اسرار شہنشاہی از راقم

۸- سر دلبراں ص ۹-۲۵۸

۹- مختار مسعود' لوح ایام ص ۲۱۴

۱۰- ایضاً ص ۴۸۱

۱۱- سر دلبراں ص ۲۳۸

۱۲- ایضاً ص ۲۷۰

۱۳- حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی' انفاس العارفین اردو ترجمہ ص ۲۰۶

۱۴- حصن حصین' اردو ترجمہ ص ۱۱۱

۱۵- عبدالماجد دریا آبادی' تفسیر ماجدی' ص ۳

۱۶- قاضی محمد سلیمان منصور پوری' شرح اسمائے حسنیٰ ص ۱۵۶

۱۷- ایضاً ص ۱۵۷

۱۸- ایضاً ص ۱۵۸

۱۹- ایضاً ص ۵۱

۲۰- ایضاً ص ۴۷

۲۱- ایضاً ص ۱۱۱

۲۲- ابونصر سراج طوسی' کتاب اللمع ترجمہ پیر محمد حسن ص ۹۴-۹۵

۲۳- ایضاً ص ۹۷

۲۴- سر دلبراں ص ۲۳۹

۲۵- راقم۔ احوال و مقامات سلطان باہو ص ۱۳۸

۲۶- سر دلبراں ص ۳۴۴

۲۷- ایضاً

۲۸- انے ماری شمل' ص ۴۲۰

۲۹- ایضاً ص ۴۱۹